تدبّر

زیرِ نگرانی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّر قرآن وحدیث

تدبّر

شمارہ نمبر ۱۱ | شوال ۱۴۰۴ھ | جولائی ۱۹۸۴ء

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ

تحقیقِ عمرِ عائشۃ الصدیقہؓ ——— خالد مسعود ۳

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۃ بقرہ (۱۱) ——— خالد مسعود ۱۰

اصولِ تدبرِ حدیث

تدبرِ حدیث کے لیے امہاتِ فن کا انتخاب ——— امین احسن اصلاحی / ماجد خاور ۱۷

تدبرِ حدیث

ستاروں کی تاثیر کا عقیدہ ——— خالد مسعود ۲۷

تزکیۂ نفس

انسان کا تعلق اپنی ذات سے ——— امین احسن اصلاحی ۳۱

حکمتِ دین

عید الاضحیٰ کا پیغام ——— امین احسن اصلاحی / عبداللہ غلام احمد ۴۲

مراسلہ و مذاکرہ

مطالعہ کے لیے معیارِ انتخاب ——— شیخ سلطان احمد ۴۷

مجلسِ ترتیب:

- خالد مسعود (مدیر)
- عبداللہ غلام احمد
- ماجد خاور
- محبوب سبحانی

ناشر : ———— ادارہ تدبرِ قرآن وحدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور - ۲۵

مطبع : ———— المطبعۃ العربیۃ۔ لاہور

قیمت : =/۴ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ

خالد مسعود

تحقیقِ عُمرِ عائشۃ الصدیقہؓ

ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی شخصیت کا ایک رخ جس سے دین سے بہرہ مند ہونے والا ہر مسلمان شناسا ہے یہ ہے کہ وہ اس امت کی ایک عظیم محسنہ ہیں۔ دین کا ایک بڑا حصہ ان کے ذریعے امت کو منتقل ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کے متعلق تو تقریباً تمام تر معلومات انہی کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہیں۔ وہ بڑی زیرک، ذکی وفہیم خاتون تھیں جنہوں نے بڑے شوق اور انہماک کے ساتھ رموزِ دین سے آگاہی حاصل کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا ایک ایک لمحہ تحصیل علم میں گزارا اور اس علم کو زندگی بھر مسلمانوں کو منتقل کرتی رہیں۔ وہ اتنی بڑی فقیہہ تھیں کہ امت کے زعما ان سے دینی معاملات میں فتویٰ لیتے۔ متعدد مسائل میں انہوں نے بڑے بڑے صحابہؓ کی رایوں سے اختلاف کیا اور اپنے موقف کے حق میں مسکت دلائل دیے۔ بعض صحابہؓ کی روایتِ حدیث پر انہوں نے گرفت کی اور واضح فرمایا کہ اصل معاملہ یوں پیش آیا تھا لیکن ان صحابی نے اس کی توجیہہ میں غلطی کر دی۔ ان کی اپنی روایت کردہ حدیثوں میں بھی ان کی ذکاوت وفطانت جھلکتی ہے۔ اس بات کے متعدد شواہد موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں میں حضرت عائشہؓ کا خاص مقام تھا۔ دوسری امہات المومنین بھی اس حقیقت سے واقف تھیں۔ وہ بھی ان کی قدر کرتیں اور ان کو مواقع فراہم کرتیں تاکہ وہ فیضِ نبوی سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہو سکیں۔ ام المومنین کی شخصیت کے اس پہلو کا تقاضا یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی رفاقت کا زمانہ ایسا ہو جس میں وہ اعلیٰ ذہنی اور فکری صلاحیتوں سے مالا مال ہوں اور ان کو بروئے کار لا کر حضورؐ سے فیض یاب ہوئی ہوں۔

تاریخ کی کتابوں اور حدیث کی بعض روایات کی روشنی میں دیکھیے تو یہی حضرت عائشہؓ ایک بالکل مختلف روپ میں نظر آتی ہیں۔ اس روپ میں چھ سال کی عمر میں ان کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نو سال کی عمر میں رخصتی کی نوبت آتی ہے۔ اس وقت تک وہ سنِ شعور کو نہیں پہنچتیں۔ رخصت ہو کر جاتی ہیں تو اپنے کھلونے رسول اللہ

کے گھر میں اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ وہاں بھی کھیل کے ساتھ ان کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ کبھی مدینہ کی لڑکیوں بالیوں کو اپنے گھر بلا کر ان کے ساتھ کھیلتی ہیں اور کبھی گانے والیوں سے گانے سنتی ہیں۔ وہ اپنی زبان سے اس بات کا اظہار بھی کرتی رہتی ہیں کہ وہ کھیل کی بڑی رسیا ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی شخصیت کی اس تصویر کشی سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ ان کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رفاقت کا زمانہ ان کے بچپن کا غیر ذمہ دارانہ اور غیر سنجیدہ دور تھا جس میں ان کی اصل دلچسپی تحصیلِ علم کے ساتھ نہیں بلکہ کھیل کے ساتھ رہی۔ جب وہ سنِ رشد کو پہنچیں تو آنحضرتؐ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

افسوس ناک امر یہ ہے کہ امّ المومنین کی شخصیت کے اوّل الذکر بیان سے تو صرف وہ لوگ واقف ہیں جو دین کے علوم سے بہرہ ور ہیں۔ گویا اہل علم کا ایک محدود طبقہ انہیں اس انداز سے دیکھتا ہے۔ عوام الناس میں ان کے بارے میں جو رائے قائم ہوئی ہے وہ موخر الذکر روپ ہی پر مبنی ہے جس کا خوب خوب چرچا کیا گیا ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ دو متضاد کردار ایک ہی شخصیت کے نہیں ہو سکتے۔ کسی المیہ کے نتیجہ میں بعض باتیں امّ المومنین کی طرف غلط منسوب ہو گئیں جو ان کی شخصیت کو داغدار کرتی ہیں تاکہ امتِ مسلمہ میں ان کو جو عظیم مرتبہ حاصل ہے اس کو مجروح کیا جائے۔ یہ المیہ کب اور کیسے پیش آیا؟ یہ بات جاننے کا کوئی آسان ذریعہ موجود نہیں۔ صدیوں پرانی باتوں کی تحقیق کے لیے وسائل اور صلاحیت دونوں چیزوں کی ضرورت ہے اور ان کا یکجا میسر ہونا ایک مشکل کام ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ اپنے کسی بندے کو توفیق دے دیتا ہے اور یہ مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے۔ یہ توفیق سرگودھا کے جناب حکیم نیاز احمد صاحب کو حاصل ہوئی اور انہوں نے امّ المومنین کی عمر کے مسئلہ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ سالہا سال کی محنت کے بعد وہ یہ سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئے کہ امّ المومنین کو کھلنڈری بچی بتلانے والی روایات کے ماخذ کیا ہیں، ان روایات میں ضعف کے کیا کیا پہلو ہیں اور کیوں یہ قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جا سکتیں۔ انہوں نے اپنی یہ تحقیق ایک ضخیم کتاب "تحقیقِ عمر عائشۃ الصدیقہؓ" میں بیان کی ہے جو مشکور اکیڈیمی ۸۹/F بلاک نمبر۲ پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی ۲۹ نے شائع کی ہے۔

فاضل مصنف نے کتاب کے پہلے حصہ میں ان تمام روایات پر جرح کی ہے جو امّ المومنین کو کم عمر بتاتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم روایت جو بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ، سب نے بیان کی ہے وہ تزوج عائشہ کی یہ روایت ہے کہ

نکح النبی عائشۃ وھی بنت ست	آنحضرتؐ نے عائشہؓ سے اس وقت نکاح کیا جب
سنین وبنیٰ لھا وھی بنت	وہ چھ برس کی تھیں، ان کی رخصتی کرائی جب وہ نو
تسع سنین ومات عنھا وھی	برس کی تھیں اور وہ اٹھارہ برس کی تھیں جب

بنت ثمانی عشر ۔	حضورؐ کا انتقال ہوگیا۔

یہ ایک ایسی روایت ہے جس کے واحد راوی تمام معتبر کتب حدیث میں ہشام بن عروہؒ ہیں جو اپنے والد عروہ بن الزبیرؒ سے اسے روایت کرتے ہیں۔ نہایت فاضلانہ بحث کے بعد مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس نادر روایت کا ۱۴۵ھ سے پہلے کوئی راوی نہ تھا، اسی لیے وہ تمام کتب حدیث جو اس سے قبل مرتب ہوئیں اس روایت سے خالی ہیں۔ ہشام بن عروہؒ کی ساری عمر مدینہ منورہ میں گزری لیکن وہاں کے حفاظِ حدیث نے ان سے یہ روایت بیان نہیں کی اس کے برعکس گیارہ حفاظِ حدیث جو تمام تر عراقی ہیں، ہشام سے اس روایت کے ذمہ دار ہیں اور انہی کی روایت کتب حدیث میں نقل ہوئی ہے۔ ہشام نے عراق کا ایک سفر ۱۴۵ھ میں ۸۳ برس کی عمر میں کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت وہ یہ روایت زبان پر لائے جسے عراقیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس وقت اس روایت کی غلطی پر گرفت کرنے والے یا متبادل معلومات فراہم کرنے والے دنیا میں موجود نہ تھے اس لیے عمر عائشہؓ کے بارے میں ہشام کے بیان کو حرفِ آخر تسلیم کر لیا گیا اور جب اس روایت نے صحاح میں راہ پالی تو گویا پوری امت کے نزدیک اس کو پایۂ قبول حاصل ہو گیا۔ اس سے الگ ہو کر تحقیق کی کسی نے زحمت ہی گوارا نہ کی۔ اس کے بعد بعض محدثین نے روایت کے متن کو مستحکم کرنے کے لیے اسے اپنی محبوب اسناد کے ساتھ متعلق کر دیا۔ اس طرح کی روایتیں بظاہر ہشام کی روایت کی شاہد معلوم ہوتی ہیں لیکن جرح و تعدیل سے کام لیا جائے تو ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ تمام اسناد تدلیس کا شاہکار ہیں۔ فاضل مصنف نے تمام کتب حدیث کی ایک ایک سند پر بحث کر کے دکھایا ہے کہ ان میں انقطاع اور تدلیس پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض راوی بالکل غیر ثقہ، کذاب اور وضاع ہیں۔

فاضل مصنف نے ان تمام روایات کو بھی پرکھا ہے جن سے حضرت عائشہؓ کی کم عمری کا تاثر ملتا ہے مثلاً صحاح میں حضرت عائشہؓ کا یہ بیان کہ میرے ساتھ گڑیاں کھیلنے کے لیے اڑوس پڑوس کی چھوکریاں آجاتی تھیں۔ مصنف کی تحقیق میں یہ روایت بھی ہشام ہی سے مروی ہے۔ یہ ایک مستقل روایت ہے جس میں حضرت عائشہؓ کی مکی زندگی کے اس دور کا بیان تھا۔ جب وہ فی الواقع کم عمر کی تھیں۔ لیکن اسے تزوج والی حدیث کے ساتھ مربوط کر دیا گیا تاکہ اس کا بیان حقیقی نظر آئے۔ اگر یہ مدینہ منورہ کا واقعہ ہوتا تو حضرت عائشہؓ کی یہ سہیلیاں غیر معروف نہ ہوتیں بلکہ تاریخ کا ایک حصہ بنتیں۔

عید کے موقعہ پر دو لونڈیوں کے جنگ بعاث کے گانے گانے اور حضرت عائشہؓ کے حبشیوں کے جنگی کرتب دیکھنے کی روایات کے بارے میں مصنف کی رائے یہ ہے کہ ان سے امّ المومنین کا بچپن یا کھلنڈرا پن ثابت ہی نہیں ہوتا۔ نیز راویوں نے ان میں تلفیق کی ہے یعنی مختلف موقعوں کی باتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

جس سے ان واقعات پر ایک ایسا رنگ چڑھ گیا ہے جو ان کی اصل ماہیت کو واضح نہیں ہونے دیتا۔ مصنف نے اس بات کے بکثرت شواہد پیش کیے ہیں کہ بعض راویوں نے اپنی طرف سے اصل روایات پر اضافے کرکے ان کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اس ضمن میں انہوں نے شیعہ راوی عبدالرزاق کو خاص طور پر ذمہ دار گردانا ہے۔ انہی عبدالرزاق کو فاضل مصنف نے واقعہ افک کی روایت میں ان جملوں کے اضافہ کا ذمہ دار قرار دیا ہے جو حضرت عائشہؓ کو کم عمر، کم عقل، غافل اور نہ جانے کیا کیا ثابت کرتے ہیں۔

تزوج عائشہ کی روایت میں ضعف کے پہلو بیان کرنے کے باوجود فاضل مصنف نے حسن ظن سے کام لیتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے کہ ہشام کی روایت میں نکاح اور رخصتی کی عمر میں چھ اور نو کے عدد کے ساتھ عشرۃ یا عشرین یعنی دہائی کے ہندسے بھی رہے ہوں گے یعنی عمر بوقت نکاح ۱۶ یا ۲۶ اور بوقت رخصتی ۱۹ یا ۲۹ برس بیان کی گئی ہوگی لیکن نقل کرتے وقت دہائی کے یہ ہندسے لکھنے سے رہ گئے۔ بعد میں اس غلطی پر اور ردے چڑھائے گئے حتیٰ کہ حضرت عائشہؓ اور ان کی کم عمری لازم و ملزوم بن گئی۔

ہمیں مصنف کے اس نتیجۂ تحقیق سے تو اتفاق ہے کہ ام المومنین کی عمر بوقت رخصتی ۱۹ یا ۲۹ برس رہی ہو۔ لیکن ہندسے چھوٹنے کی یہ توجیہ محلِ نظر ہے۔ روایت میں اگر عدد ایک مرتبہ بیان ہوتا تو یہ توجیہ بالکل فطری ہوتی لیکن یہاں عدد تین مرتبہ بیان ہوا ہے۔ نیز اس میں ثمانی عشرۃ کا عدد بھی ہے جس کے ساتھ مزید عشرۃ یا عشرین کا اضافہ بے معنی ہوگا۔ لہٰذا اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ خود ہشام کو ذہول ہوا ہو یا کسی نے باقاعدہ منصوبہ کے تحت اعداد میں رد و بدل کیا ہو اور ناقص صورت میں یہ روایت مشہور کر دی ہو۔ معاندین صحابہ کی اس طرح کی کارروائیوں سے ہماری کتابیں محفوظ نہیں رہی ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں فاضل مصنف نے وہ قرائن جمع کیے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رخصتی کے وقت ام المومنین کی عمر ۲۹ سال یا کم از کم ۱۹ سال تھی، اگرچہ خود مصنف یہ رائے رکھتے ہیں کہ عمر کا تعین ہمیں نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ثابت کرنا کافی ہے کہ رخصتی کے وقت حضرت عائشہؓ سنِ رشد کو پہنچی ہوئی تھیں۔ اس کے قرائن و شواہد مندرجہ ذیل ہیں:

(ا) سیرت ابن ہشام میں محمد بن اسحاق (جو ہشام بن عروہ کے ہم عصر ہیں) کی روایت سے قبول اسلام میں سبقت کرنے والوں کی جو فہرست دی گئی ہے اس کے مطابق حضرت عائشہؓ نبوت کے پہلے سال میں اپنی بہن اسماءؓ کے ساتھ ایمان لائیں۔ قسطلانی کی مواہب لدنیہ، زرقانی کی شرح مواہب اور حیات سید العرب میں بھی ان کو سابق الایمان افراد میں شمار کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱ نبوی میں یہ اسلام لانا سنِ شعور میں ہونا چاہیے۔ اگر وہ دودھ پیتی بچی تھیں تو ایمان کی مکلف نہ تھیں۔

ب۔ سورہ قمر کی آیت بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ کے بارے میں ان کی روایت موجود ہے کہ اس آیت کا نزول مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ سورہ قمر کا زمانہ نزول ۴ نبوی ہے گویا اس وقت وہ عمر کے اس دور میں تھیں جس میں آدمی چیزوں میں امتیاز کرنے کے قابل ہوتا ہے اور ان کو یاد بھی رکھ سکتا ہے۔

ج۔ صحیح بخاری میں ہجرت حبشہ کی روایت حضرت عائشہؓ سے ہے۔ اس روایت میں وہ اسلام کے تیرہ سالہ مکی دور پر جامع تبصرہ کرتی اور چشم دید واقعات بیان کرتی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی جس ہجرت حبشہ کا ذکر اس روایت میں ہے وہ ۵ نبوی میں پیش آئی۔ ظاہر ہے کہ ایک عاقل و بالغ آدمی ہی اپنے مشاہدات اس قدر تفصیل سے بیان کر سکتا ہے۔ لہٰذا ۵ نبوی میں ام المومنین کی عمر ایسی ہونی چاہیے جس میں آدمی معاملات کو سمجھتا اور گہرے مشاہدہ پر مبنی رائے دینے کے قابل ہوتا ہے۔

د۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضورؐ کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ آپ کا گھر سنبھالنے کے لیے کوئی خاتون موجود ہوں۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے حضرت خولہؓ بنت حکیم نے آپ کے لیے دو رشتے تجویز کیے، ایک حضرت سودہؓ کا اور دوسرا حضرت عائشہؓ کا۔ اس وقت اگر حضرت عائشہؓ چند برس کی بچی ہوتیں تو خولہ کی یہ تجویز انتہائی غیر موزوں تھی۔ کیونکہ آنحضرتؐ کو خانگی ذمہ داریاں اٹھانے والی بیوی کی ضرورت تھی نہ کہ گڑیوں سے کھیلنے والی ایک بچی کی۔ خولہ کی تجویز جب حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش کی گئی تو اس کے جواب میں انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ عائشہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بھتیجی کے حکم میں ہیں، یہ نکاح کے لیے کیسے موزوں ہو سکتی ہیں۔ اگر حضرت عائشہؓ اس وقت بچی ہوتیں تو حضرت ابوبکرؓ کا معقول عذر یہ ہوتا کہ آنحضرتؐ کے گھر کی ذمہ داریاں یہ بچی کیسے سنبھال سکتی ہے؟

ہ۔ مسند احمد میں حضرت عائشہؓ کے نکاح کی تجویز کا مفصل بیان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات سے پہلے حضرت عائشہؓ کا نکاح جبیر بن مطعم بن عدی سے ہو چکا تھا۔ جبیر اسلام کا سخت دشمن تھا۔ اختلاف عقیدہ کی بنا پر مطعم بن عدی لڑکی کی رخصتی کروانے سے گریز کر رہے تھے۔ جب خولہؓ نے آنحضرتؐ کے لیے حضرت عائشہؓ کا رشتہ تجویز کیا تو حضرت ابوبکرؓ مطعم کے پاس گئے اور رخصتی کے بارے میں دو ٹوک فیصلہ کرنے کو کہا۔ اس خاندان کو اسلام سے جو کد تھی اس کی بنا پر انہوں نے معذوری ظاہر کی چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے حسنِ تدبیر سے طلاق دلوائی۔ اس طرح حضرت عائشہؓ آنحضرتؐ سے نکاح کے لیے آزاد ہو گئیں۔ اس زمانہ میں جبیر ایک جوان آدمی تھا اور اسلام کے خلاف سازشوں میں حصہ لیتا تھا۔ نیز وہ رئیس مکہ کا بیٹا تھا جس کے لیے جوان لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ ایسا کوئی سبب موجود نہیں کہ وہ ایک چند سالہ بچی کے ساتھ نکاح کے لیے آمادہ ہو گیا ہو جس کی بلوغت کے انتظار میں اسے مزید دس گیارہ برس تجرد کی زندگی گزارنی پڑے۔ لہٰذا جبیر کا نکاح بھی حضرت عائشہؓ کی بلوغت کے بعد ہی ہوا ہوگا جو عرب کا معروف طریقہ تھا۔

و۔ طبقات ابن سعد میں ہجرت مدینہ کا واقعہ خود حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ آنے کے بعد جب کچھ عرصے تک آنحضرتؐ نے رخصتی نہیں لی تو حضرت ابوبکرؓ نے خود پوچھا کہ رخصتی لینے میں کیا امر مانع ہے۔ آنحضرتؐ نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ میں بچی کی بلوغت کا انتظار کر رہا ہوں بلکہ یہ فرمایا کہ میرے پاس مہر میں دینے کے لیے رقم نہیں ہے۔ گویا حضرت عائشہؓ کے بچپنے کا کوئی مسئلہ اس وقت نہ تھا۔

ز۔ کتب حدیث میں یہ روایت بیان ہوئی ہے کہ ۱ھ میں جب بہت سے مہاجرین بیمار پڑ گئے تو حضرت عائشہؓ ان میں سے بعض کی عیادت کو گئیں۔ واپس آکر انہوں نے آنحضرتؐ کے سامنے ان کی حالت کی صحیح تصویر کشی کی اور ان کی زبانوں سے جو حسب حال اشعار سنے تھے وہ بھی سنائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا کسی نو سالہ بچی کے بس میں نہیں ہوتا۔

ح۔ بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق حضرت عائشہؓ غزوہ بدر و احد میں موقع جنگ پر موجود تھیں اور سخت ترین حالات میں انہوں نے زخمیوں کو پانی پلانے کی خدمت سرانجام دی۔ ان غزوات میں نابالغ لڑکوں کو تو شرکت سے روک دیا گیا تھا، آخر کیا سبب تھا کہ حضرت عائشہؓ کی کم سنی اس میں رکاوٹ نہ بنی اور انہوں نے کام بھی وہ کیے جو بڑوں کے کرنے کے تھے۔ لہٰذا کم سنی کا قصہ ہی خلاف حقیقت ہے۔

ط۔ آپ انساب کی ماہر تھیں جو حضرت ابوبکرؓ کا خاص فن تھا۔ نیز آپ کو اشعار بکثرت یاد تھے جن کو وہ برمحل استعمال کرتی تھیں۔ انساب اور اشعار میں اس مہارت کے لیے ضروری ہے کہ انہیں اپنے والد سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا بھرپور موقع میسر آیا ہو۔ اگر وہ گڑیا کھیلتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آ گئی تھیں تو یہ فنی کمال انہیں کہاں سے حاصل ہو گیا اور اس تربیت کا زمانہ کون سا ہے!

ی۔ احکام دین کی مصلحتوں، حکمتوں اور ان کے ارتقاء سے جس قدر باخبر آپ ہیں، اتنا باخبر کوئی نہیں۔ ان کی فقیہانہ آراء سے کتب حدیث بھری ہوئی ہیں۔ کیا یہ فکری گہرائی اور گیرائی ایک کم سن بچی کی ہو سکتی ہے! ماننا پڑے گا کہ آنحضرتؐ کے ساتھ رفاقت کے دور سے پہلے حضرت عائشہؓ ذہنی و فکری اعتبار سے نہایت پختہ ہو چکی تھیں اور عمر کے اس حصہ میں تھیں جب ان کی فکری صلاحیتیں عروج پر تھیں۔ اس لیے وہ ہر معاملہ کو اس کے صحیح سیاق و سباق میں سمجھنے کے قابل ہوئیں اور اپنی صائب آراء سے امت کو فائدہ پہنچایا۔

اس فاضلانہ تصنیف میں علم حدیث سے متعلق بعض اہم مباحث بھی ملتے ہیں۔ اس میں ایک قابل قدر بحث میں درایت حدیث کے اصول بیان ہوئے ہیں۔ مصنف کے نزدیک تزوج عائشہؓ کے بارے میں ہشام کی روایت ان اصولوں پر پوری نہیں اترتی۔

مصنف نے صدر اوّل میں علم حدیث کے ارتقاء کے ادوار بھی متعین کیے ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق تابعین

اور تبع تابعین کے زمانے میں روایات کو پرکھنے کا رجحان تو پایا جاتا تھا لیکن نقد حدیث کا باقاعدہ فن ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے اس دور میں روایات میں بکثرت تلفیق ہوئی یعنی مختلف روایتیں باہم گڈمڈ ہو گئیں۔ نقد حدیث کا فن نہ ہونے کے باعث حدیث کی ابتدائی کتابوں مثلاً مؤطا امام مالکؒ اور مسند امام ابی حنیفہؒ میں مرسل روایات بکثرت موجود ہیں اور ان ائمہ نے مرسلات ثقہ کی صحت کو تسلیم کر لیا۔ نقد حدیث کا فن ۱۸۰ھ کے بعد وجود میں آیا اور صحاح کی تدوین میں اس سے کام لیا گیا لیکن اس سے پہلے کی روایات میں جو تلفیق ہو چکی تھی وہ ثقہ کی روایت کی حیثیت سے صحاح میں بھی برقرار رہی۔

زیر نظر کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ ایک ذہین قاری اس سے تحقیق حدیث کا طریق کار بھی سیکھ سکتا ہے۔ امّ المومنین کی عمر کی تحقیق کی خاطر مصنف نے کس طرح ذخیرۂ حدیث کو کھنگالا، راویوں کی جرح و تعدیل کے لیے کون سے وسائل اختیار کیے، روایتوں کے اصل مضمون تک کس طرح رسائی حاصل کی، راویوں کے اضافوں کا سراغ کیسے لگایا اور کس طرح ان راویوں کا متعین کیا جو ان اضافوں کا باعث بنے، یہ معلومات کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہیں جس سے تحقیق حدیث کی عملی تربیت ہوتی ہے۔

فاضل مصنف اس گراں قدر تصنیف پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ انہوں نے امّ المومنین کی حیثیت ہی کو واضح نہیں کیا بلکہ دراصل ان خلاف واقعہ باتوں کی بیخ کنی کی ہے جن کو دشمنان اسلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ اس دور میں ایسی کتاب کی ضرورت تھی جسے جناب حکیم نیاز احمد صاحب نے پورا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

بقیہ: تفسیر سورۃ البقرہ (۱۱)

نہیں ڈالتا ۳۴۹ ہر ایک پائے گا جو کمائے گا اور بھرے گا جو کرے گا۔ اے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہم سے مواخذہ نہ فرمانا۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر اس طرح کا کوئی بار نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے ہو گزرے۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ لاد جس کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہمیں معاف کر، ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما، تو ہمارا مولیٰ ہے، پس کافروں کے مقابل میں ہماری مدد کر ۳۵۰ ۲۸۶

۳۴۹ یعنی ہر شخص بس اسی حد تک مکلف ہے جس حد تک اس کو طاقت عطا ہوئی ہے۔ جو چیز اس کے حدود اختیار و امکان سے باہر ہے اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

۳۵۰ یہ اس بات کی دعا ہے کہ سمع و طاعت کی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے کوئی بھول چوک ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر مواخذہ نہ فرمائے، شریعت اس طرح کے اصر و اغلال سے پاک رہے جو یہود کی شریعت میں تھے، اللہ تعالیٰ ان خارج از استطاعت آزمائشوں سے محفوظ رکھے جو شریعت کے حقوق ادا کرنے کی راہ میں پیش آسکتی ہیں اور مخالفین کے مقابل میں مسلمانوں کی مدد و نصرت فرمائے۔

تدبر قرآن

خالد مسعود

تفسیر سورۃ بقرہ (۱۱)

۳۱۶ ان لوگوں کے مال کی تمثیل جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانے کے مانند ہے جس سے سات بالیاں پیدا ہوں اور اس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ ۳۱۷ اللہ برکت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اللہ بڑی گنجائش والا اور علم والا ہے۝ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے نہ دل آزاری کرتے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ اور نہ تو ان کے لیے کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۝ دلداری کا ایک کلمہ کہہ دینا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو۔ ۳۱۸ اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۝ اے ایمان والو، احسان جتا کر اور دل آزاری کر کے اپنی خیرات کو اکارت مت کرو، اس شخص کے مانند جو اپنا مال دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر وہ ایمان نہیں رکھتا۔ ایسے شخص کی تمثیل یوں ہے کہ ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کا

---

۳۱۶ روشفاعت اور ہدایت و ضلالت کے قانون کی ضمنی بحث ختم ہونے کے بعد اب انفاق کی برکات، خصوصیات اور آفات کے مضمون کو لیا ہے۔

۳۱۷ یہ تمثیل اس بڑھوتری کی ہے جو راہ خدا میں خرچ کیے ہوئے مال کے اجر و ثواب میں ہوگی۔ عمل کی نوعیت اور عمل کرنے والے کے ظاہری و باطنی حالات کے لحاظ سے نیکیوں کا بدلہ دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک ملے گا۔

۳۱۸ آدمی میں اگر فنا کے ساتھ حلم نہ ہو تو وہ انفاق کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ مال داروں کے اندر عموماً ایک احساس برتری پیدا ہو جاتا ہے اس وجہ سے وہ محتاجوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے اور مانگنے والوں کو جھڑک دیتے ہیں۔ یہاں ہدایت فرمائی ہے کہ مال دار دلداری اور عفو و درگزر کی عادت ڈالیں۔

مینہ پڑے اور وہ اس کو بالکل سپاٹ پتھر چھوڑ جائے۔ ۳۱۹ ان کی کمائی میں سے کچھ بھی ان کے پلے نہیں پڑے گا اور اللہ ناشکروں کو بامراد نہیں کرے گا۝ ۲۶۴

اور ان لوگوں کے عمل کی تمثیل جو اپنے مال اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دلوں کو جمائے رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں ۳۲۰ اس باغ کے مانند ہے جو بلندی پر واقع ہو۔ اس پر بارش ہو گئی تو دو چند پھل لایا، بارش نہ ہوئی تو پھوار بھی کافی ہو گئی اور اللہ جو کچھ بھی تم کر رہے ہو اس کو دیکھ رہا ہے۝ ۲۶۵

کیا تم میں سے کوئی بھی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، نیچے اس کے نہریں بہہ رہی ہوں، اس میں اس کے واسطے ہر قسم کے پھل ہوں اور وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے ابھی ناتواں ہوں اور باغ پر سموم کا بگولا پھر جائے اور وہ جل کر خاک ہو جائے۔ اللہ اس طرح اپنی باتیں تمہارے لیے واضح کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔ ۳۲۱ ۝ ۲۶۶

اے ایمان والو، اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ ۳۲۲ مال میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں اور اس میں سے وہ مال تو خرچ کرنے کا خیال بھی نہ کرو جس کو خدا کی راہ میں

---

۳۱۹ اس تمثیل سے احسان جتانے اور ایذا دینے کی غایت درجہ سنگینی واضح ہوتی ہے۔ آدمی کے انفاق کو برباد کر دینے کے معاملے میں یہ باتیں بالکل خدا اور آخرت کے انکار کے برابر ہیں۔ ایمان پر ہونے کے باوجود ایسے لوگ اپنی ساری خیر خیرات ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ اس کا کوئی حصہ بھی وہ بچا نہیں پاتے۔

۳۲۰ یعنی وہ اپنے مال خدا کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ اس مقصد کے لیے بھی خرچ کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے نفس کی تربیت کریں کہ وہ دین کے احکام کی تعمیل میں پختہ ہو جائے۔ گویا انفاق سے انسان اپنے نفس پر قابو پاتا ہے اور خدا کے قرب کی راہ اس کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔ تربیت کے نقطۂ نظر سے اعلیٰ انفاق وہ ہے جو قحط کے زمانہ میں ہو، جو عزت کے باوجود ہو، جو اپنی ذاتی ضروریات کو نظرانداز کر کے ہو اور جو عزیز و محبوب مال میں سے ہو۔

۳۲۱ ریاکاری، احسان داری اور ایذا رسانی کے ساتھ انفاق کرنے والے آخرت میں عین اس وقت اپنی امیدوں کے باغ کی بربادی کا حسرت انگیز منظر دیکھیں گے جب وہ اس کے سب سے زیادہ محتاج ہوں گے اس لیے کہ اس وقت ان کے لیے سعی و عمل کے دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔

۳۲۲ پاکیزہ مال کے لیے 'طیبات' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو بیک وقت دو باتوں کو ظاہر کرتا ہے ایک یہ کہ وہ مال پاکیزہ طریقہ سے کمایا گیا ہو، غلط یا مشتبہ طریقہ سے نہ آیا ہو۔ دوسری یہ کہ مال بجائے خود اچھا ہو۔ بے وقعت، گھٹیا یا نکما نہ ہو

تو خرچ کرنے پر آمادہ ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تمہیں لینا پڑ جائے تو بغیر آنکھیں میچے اس کو نہ لے سکو[۲۲۳] اور اس بات کو خوب یاد رکھو کہ اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات[۲۲۴] ہے ۞ ۲۶۷

شیطان تمہیں تنگ دستی سے ڈراتا اور بے حیائی کی راہ سجھاتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے ۞ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ[۲۲۵] ملا۔ مگر یاد دہانی وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں ۞ ۲۶۹

اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے یا جو کچھ بھی نذر مانو گے تو یاد رکھو کہ اللہ اس سے اچھی طرح واقف ہے اور ان لوگوں کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں ۞ ۲۷۰

اور اگر تم اپنے صدقات[۲۲۸] ظاہر کر کے دو تو وہ بھی اچھا ہے اور اگر تم ان کو چھپاؤ اور چپکے سے غریبوں کو دے دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اور اللہ تمہارے گناہوں کو جھاڑ دے گا اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے ۞ ۲۷۱

---

۲۲۳ جس چیز کو آدمی اپنے لیے پسند نہ کر سکے وہ خدا کو پیش کرنا، درآں حالیکہ سب کچھ اسی کا بخشا ہوا ہے، انتہائی ذلت کی بات ہے اور اس سے خدا کی خوشنودی یا نفس کی تربیت ہونا تو الگ رہا اس سے مزید دوری و مہجوری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔

۲۲۴ اللہ کسی کے مال کا محتاج نہیں، اس کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ وہ اگر انفاق کا حکم دیتا ہے تو اس سے لوگوں کی وفاداری کا امتحان مقصود ہے۔

۲۲۵ یہاں مزاحمتوں کی طرف اشارہ ہے جو انفاق کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ ایک تو مستقبل کے موہوم خطرات کے سبب سے آدمی ہاتھ روکے رکھتا ہے دوسرا وہ عیاشی اور نفس کی راہ میں فضول خرچی کی لت میں پھنس جاتا ہے اور اللہ اور اس کے بندوں کا حق ادا کرنے کے قابل ہی نہیں رہ جاتا۔

۲۲۶ یعنی جو لوگ اس دنیائے فانی کی لذتوں پر فریفتہ ہو جانے کے بجائے خدا کی مغفرت اور اس کے فضل کے حصول کے لیے اپنے مال لٹاتے ہیں وہ اس کے صلے میں اپنے دل کے خزانے حکمت کے لعل و گہر سے بھرتے ہیں۔

۲۲۷ نذر کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی منت مانے کہ اگر میری فلاں مراد پوری ہوگئی تو میں فلاں عبادت یا ریاضت یا اتنا صدقہ کروں گا۔ اسلام میں منت ماننے کو مستحسن نہیں قرار دیا گیا لیکن کوئی شخص اگر منت مان بیٹھے جس میں کسی شرعی قباحت کا کوئی پہلو نہ ہو تو اس کو پورا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

۲۲۸ یہاں صدقات واجبہ مراد نہیں جو علانیہ دیے جاتے ہیں بلکہ صدقات و خیرات مراد ہیں۔

ان کو ہدایت دینا تمہارے ذمے نہیں ہے بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے اس کا نفع تمہیں کو حاصل ہونا ہے اور نہ خرچ کیجیو[۲۲۹] مگر اللہ کی رضا جوئی ہی کے لیے اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے وہ تم کو پورا کر دیا جائے گا اور تمہارے حق میں ذرا بھی کمی نہ کی جائے گی ۞ ۲۷۲

یہ ان غریبوں کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں[۲۳۰] زمین میں کاروبار کے لیے نقل و حرکت نہیں کر سکتے۔ بے خبر ان کی خودداری کے سبب ان کو غنی خیال کرتا ہے، تم ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے[۲۳۱]۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اس کو خوب جانتا ہے ۞

جو لوگ اپنے مال رات اور دن پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور نہ ان کے لیے خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۞ ۲۷۴

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے مگر اس شخص کے مانند جس کو شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے کہا کہ بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے اور حال یہ ہے کہ اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا اور سود کو حرام[۲۳۲]۔ تو جس کو اللہ کی تنبیہ پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ لے چکا وہ اس کے لیے ہے۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اب اس کے مرتکب ہوں تو وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں

---

۲۲۹ یعنی جو کچھ تم خرچ کرتے ہو یہ نہ سمجھو کہ یہ کسی دوسرے کو دے رہے ہو بلکہ یہ تم اپنے ہی لیے جمع کر رہے ہو جو تمہیں بڑھا کر واپس کیا جائے گا۔ بس یہ شرط ہے کہ تمہارا یہ خرچ کرنا اللہ کی خوشنودی کے سوا کسی اور مقصد سے نہ ہو۔

۲۳۰ یہ انفاق کے مستحق گروہ کی نشان دہی ہے کہ کسی دینی مقصد نے ان کو کسب معاش کی جدوجہد سے روک رکھا ہے۔ یہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں لیکن اتنے خوددار ہیں کہ جو ان کے حال سے بے خبر ہو وہ ان کو غنی سمجھتا ہے۔ قرآن کے زمانۂ نزول میں اس آیت کے بہترین مصداق اصحاب صُفّہ تھے۔

۲۳۱ ان آیات میں اس طرز عمل کا نمونہ بھی دکھا دیا ہے جو با ایمان فقراء کا ہونا چاہیے اور اس طریقے کی طرف بھی رہنمائی کر دی ہے جو ان فقراء کے معاملے میں با ایمان اغنیاء کو اختیار کرنا چاہیے۔

۲۳۲ سود انفاق کا بالکل ضد ہے۔ انفاق کی محرک بلند ہمتی، ہمدردی، فیاضی، ایثار اور رحمدلی ہے جبکہ سود کی محرک بزدلی، خود غرضی، سنگ دلی اور دوسروں کی مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی خواہش ہے۔ انفاق کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے یہاں سود کی شناعت بیان کی ہے۔

۲۳۳ سود خور قیامت میں ایک مخبوط الحواس پاگل کی صورت میں اٹھیں گے کیونکہ وہ اپنی سود خوری کا جواز پیش کرنے کے لیے بیع کے سود کی مانند ہونے کا دعویٰ کرتے رہے اور یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کی عقل ماری گئی ہو۔ سود خور کے سنگ دل، بزدل اور دشمن انسانیت سرمایہ کو ایک تاجر کے جانباز، غیور اور خدمت گزار سرمایہ کے ساتھ کیا نسبت ہے!

ہمیشہ رہیں گے ٥ اللہ سود کو گھٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا [۲۳۳] اور اللہ ناشکروں اور حق تلفوں کو پسند نہیں کرتا ٥ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے بھلے کام کیے، نماز کا اہتمام کیا، زکوٰۃ ادا کی، ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ نہ ان کے لیے کوئی اندیشہ ہوگا نہ ان کو کوئی غم لاحق ہوگا ٥ ۲۷۷

اے ایمان والو، اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو سود تمہارا باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو ٥ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کرو تو اصل رقم کا تمہیں حق ہے۔ نہ تم کسی کا حق مارو، نہ تمہارا حق مارا جائے [۲۳۵] ٥ اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو فراخی تک اس کو مہلت دو اور بخش دو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھو ٥ اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو جو اس نے کمائی کی ہے پوری پوری مل جائے گی اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا ٥ ۲۸۱

اے ایمان والو، جب تم کسی معین مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو [۲۳۶] اور اس کو لکھے تمہارے مابین کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ اور جسے لکھنا آتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ جس طرح اللہ نے اس کو سکھایا اس طرح وہ دوسروں کے لیے لکھنے کے کام آئے اور یہ دستاویز لکھوائے وہ جس پر حق عائد

---

[۲۳۳] یہ سود کو گھٹانا اور صدقات کو بڑھانا دنیوی زندگی کے محدود تصور کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کی مجموعی زندگی کے لحاظ سے ہے۔

[۲۳۵] اس حکم کی نوعیت بالکل الٹی میٹم کی ہے تو گویا ایک اسلامی نظام میں سودی کاروبار کرنے والوں کی حیثیت باغیوں اور مفسدوں کی ہے جن کی سرکوبی کے لیے عند الضرورت فوجی کاروائی بھی کی جا سکتی ہے۔ طبقاتی کشمکش کو رد کرنے کے لیے یہ ہدایت فرمائی کہ صاحب اپنی اصل رقم قرضداروں سے واپس لے سکتے ہیں۔

[۲۳۶] اس ہدایت سے یہ بات نکلتی ہے کہ اہل عرب میں قرض لین دین کی معاملت زیادہ تر مالداروں ہی میں ہوتی تھی۔ تاجر لوگ اپنے تجارتی مقاصد کے لیے قرض لیتے۔ تنگ دستوں کا قرض لینا شاذ و اقعہ تھا۔ لہٰذا قرآن مجید کے احکام کا ہر قسم کے سودی لین دین پر یکساں اطلاق ہوگا۔

[۲۳۷] سودی قرضوں کے سلسلے کو یک قلم ختم کرنے کے بعد قرض دینے والوں اور قرض داروں دونوں کو نزاع اور نقصان سے محفوظ رکھنے کے لیے جو اہتمام ضروری ہے یہ اس کا بیان ہے۔ اس میں قرض کے معاملہ کی دستاویز تیار کرنے کی خاص تاکید ہے۔

ہوتا ہے [۲۳۸] اور وہ اللہ سے، جو اس کا رب ہے، ڈرے اور اس میں کوئی کمی نہ کرے۔ اور اگر وہ جس پر حق عائد ہوتا ہے، نادان یا ضعیف ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھوا دے اور اس پر اپنے لوگوں میں سے دو مردوں کو گواہ ٹھیرا لو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں سہی۔ یہ گواہ تمہارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں [۲۳۹]۔ دو عورتیں اس لیے کہ ایک بھول جائے گی تو دوسری یاد دلا دے گی [۲۴۰]۔ اور گواہ جب بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں [۲۴۱] اور قرض چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی مدت تک کے لیے اس کو لکھنے میں تساہل نہ برتو۔ یہ ہدایات اللہ کے نزدیک زیادہ قرین عدل، گواہی کو زیادہ ٹھیک رکھنے اور اس امر کے زیادہ قرین قیاس ہیں کہ تم شبہات میں نہ پڑو۔ ہاں اگر معاملہ دست بدست لین دین اور دست گرداں نوعیت کا ہو تب اس کے نہ لکھنے میں کوئی حرج نہیں اور تم کوئی معاملہ خرید و فروخت کا کرو تو اس صورت میں بھی گواہ بنا لیا کرو اور کاتب یا گواہ کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچایا جائے اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہاری بڑی پائیدار نافرمانی [۲۴۲] ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ تمہیں تعلیم دے رہا ہے اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے ٥ ۲۸۲

اور اگر تم سفر میں ہو اور کاتب نہ مل سکے تو رہن [۲۴۳] قبضہ میں کرا دو، پس اگر ایک دوسرے پر اعتماد کی صورت

---

[۲۳۸] یعنی قرض دار اس دستاویز میں اعتراف کرے کہ میں فلاں کا اتنے کا قرض دار ہوں۔

[۲۳۹] اپنے لوگوں سے مراد وہ مرد ہیں جو مسلمان اور اپنے میل جول اور تعلق کے لوگوں میں سے ہوں کہ فریقین ان کو جانتے پہچانتے ہوں۔ یہ پسندیدہ اخلاق و عمل کے ثقہ، معتبر اور ایماندار ہوں۔

[۲۴۰] گویا گواہوں کی تعداد میں فرق عورت کی تحقیر کے پہلو سے نہیں ہے بلکہ اس کی مزاجی خصوصیات اور اس کے حالات و مشاغل کے لحاظ سے ہے۔ گواہی کی ذمہ داری اس کے لیے ایک بھاری ذمہ داری ہے اس وجہ سے شریعت نے اس کے اٹھانے میں اس کے لیے سہارے کا بھی انتظام فرمایا ہے۔

[۲۴۱] گواہوں کو گواہی سے گریز کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ حق کی شہادت ایک عظیم معاشرتی خدمت بھی ہے اور شہداء اللہ ہونے کے پہلو سے اس امت کے فریضۂ منصبی کا ایک جزو بھی۔

[۲۴۲] نزاع پیدا ہونے کی صورت میں کاتب یا گواہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کسی فریق کے لیے جائز نہیں ہے۔ کاتب اور گواہ ایک اہم اجتماعی و تمدنی خدمت انجام دیتے ہیں۔ ان کو تعدی کا نشانہ بنانا شہادت کی بنیاد کو ڈھانے کی کوشش ہے۔ یہ ایک ایسا فسق ہے جو جمت کر رہ جاتا ہے اور اس کے برے نتائج سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔

[۲۴۳] رہن سے مراد وہ شے ہے جو قرض دینے والے کے قرض کی ضمانت کے طور پر اس کے قبضہ میں کرا دی جائے۔

نکل آئے تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ اس کی امانت ادا کرے[۶۴۴] اور اللہ سے، جو اس کا رب ہے، ڈرے۔ اور شہادت کو چھپاؤ مت۔ جو اس کو چھپائے تو وہ یاد رکھے کہ اس کا دل گنہگار ہے،[۶۴۵] اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو جاننے والا ہے ۝ ۲۸۳

جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے۔ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، خدا اس کا تم سے حساب[۶۴۶] لے گا، پھر جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۝ ۲۸۴

رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور مومنین ایمان[۶۴۷] لائے۔ یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ان کا اقرار ہے کہ ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی[۶۴۸] اے پروردگار! ہم تیری مغفرت کے طلب گار ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ

---

[۶۴۴] جب قرض دینے والے کے لیے اطمینان و اعتماد کی صورت پیدا ہو جائے یا اس کے وجوہ و اسباب موجود ہوں تو رہن پر قبضہ جمائے رکھنے کی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی۔ لہٰذا یہ امانت اس کے مالک کو لوٹا دینی چاہیے۔ دستاویز اور گواہی کی ضمانتیں موجود ہونے کے باوجود رہن رکھنے پر اصرار نہ صرف اسلامی اخوت و مروت کے خلاف ہے بلکہ یہ ایک قسم کی دنائت بھی ہے۔

[۶۴۵] یعنی شہادت کو چھپانا گناہ کی وہ قسم ہے جس کی تحریک دل کی گہرائیوں سے اٹھتی اور دل کے فساد کی غمازی کرتی ہے۔

[۶۴۶] مراد وہ خیالات اور وسوسے نہیں جو دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں بلکہ وہ عزائم ہیں جو مضبوط ارادے کے ساتھ دل میں موجود ہیں لیکن کسی مجبوری یا مزاحمت کے سبب سے وہ ظاہر نہ ہو سکے یا عمل میں نہ آ سکے، اللہ ان کا محاسبہ کرے گا۔

[۶۴۷] سورہ کے آغاز میں فرمایا تھا کہ قرآن مجید پر وہ لوگ ایمان لائیں گے جن کے اندر خدا ترسی، حقیقت بینی اور حق طلبی ہوگی۔ جو لوگ گروہ پرستی اور عصبیتِ قومی میں مبتلا ہوں گے وہ ایمان لانے سے محروم رہیں گے۔ اب فرمایا کہ رسول اور مومنین اس سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ خدا کو منافقین خصوصاً یہود کی اب کوئی پروا نہیں۔

[۶۴۸] سمع و طاعت کا اقرار ایک عظیم ذمہ داری کا اقرار ہے۔ اس میں بڑی بڑی آزمائشیں پیش آتی ہیں اور ہر قدم پر لغزشوں، کوتاہیوں اور ٹھوکروں کے اندیشے ہیں۔ اس سے مومنین کی زبان پر یہ دعا جاری کر دی۔ (باقی صفحہ ۹ پر)

تدبرِ حدیث کے لیے امہاتِ فن کا انتخاب

ملتِ اسلامیہ کا یہ بے مثل کارنامہ ہے کہ اس کے عظیم محدثین نے صدرِ اول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی اور صحیح علم کو ممکنہ حد تک غلط و غش سے پاک کر کے قابلِ اعتماد ذخیرۂ احادیث کی شکل میں مامون و محفوظ کیا ـــ احادیث کی جمع و تدوین کا یہ عظیم کام ائمۂ فنِ حدیث کے مقرر کردہ بے لاگ اصولوں کی روشنی میں دوسری صدی ہجری کے وسط سے لے کر تیسری صدی ہجری کے وسط کے درمیانی عرصہ میں انجام پایا۔ اس زمانے کو عصرِ روایت کے شباب کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں حدیث کا قابلِ قدر سرمایہ تحریری شکل میں مختلف مجموعوں کی صورت میں محفوظ ہو گیا اور یوں عصرِ روایت کا اختتام ہو گیا۔ اپنی صفات و خصوصیات کی بنا پر ان مجموعوں کو قبولیتِ خواص و عوام اور شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علمِ نبی کی روایت کے دور میں وضعِ حدیث کا کاروبار بڑے وسیع پیمانہ پر ہوا ہے۔ اور جیسا کہ 'وضعِ حدیث کے محرکات' کے تحت ہم اچھی طرح جائزہ لے چکے ہیں کہ اس شنیع کام کے محرکات نیک اور بد' دونوں طرح کے رہے ہیں۔ اگرچہ یہ کام بہت بڑے پیمانہ پر اور نہایت منظم طریقہ سے ہوا، لیکن یہ بھی تاریخ کی ایک اہم حقیقت ہے کہ ہمارے ائمۂ جرح و تعدیل نے ان واضعین کا تعاقب بھی بہت سرگرمی اور کامیابی سے کیا۔ ان نابکاروں نے موضوع روایات گھڑنے کو تو گھڑ لیں، لیکن ہمارے اکابر ائمہ کی مساعی کے طفیل وہ شاملِ دین نہ ہو سکیں۔ انھی کی کامیاب کوششوں کی برکت سے علمِ نبی بحیثیتِ دین شیاطین کی دراندازیوں سے بہت بڑی حد تک الحمد للہ محفوظ رہا ہے۔ اور اگر اس میں کچھ ملاوٹ ہوئی ہے تو وہ ایسی نہیں ہے کہ اگر آدمی بیدار نگاہ رکھتا ہو تو وہ اس کا امتیاز نہ کر سکے۔ بس بیداری شرط ہے اور یہ شرط ہر علم و فن میں جس طرح ضروری ہے اس سے زیادہ حدیث میں ضروری ہے۔

ذخیرۂ احادیث تو بحرِ بے کراں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر کثیر التعداد روایات جو مختلف ذرائع سے جمع کی گئی ہیں اور جن کی جمع و ترتیب مختلف ائمہ فن نے مختلف زمانوں میں کی ان کے متعلق یہ ناممکن ہے کہ ان سب مساوی مرتبہ اور اعتبار سے ہم آہنگ اور ہم رنگ ہوں اور وہ ایک ہی طبقہ اور مرتبہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس لیے ہمارے محدثین نے کتبِ حدیث کو صحت، حسن اور ضعف کے لحاظ سے مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ طبقۂ اول میں مؤطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو شامل کیا گیا ہے۔ ان مجموعوں میں متواتر، صحیح اور حسن، ہر قسم کی حدیثیں موجود ہیں۔ جہاں تک طبقۂ دوم کا تعلق ہے تو اس میں سننِ اربعہ —— یعنی ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابنِ ماجہ —— شامل ہیں۔ ان مجموعوں میں اگرچہ تمام کی تمام حدیثیں تو طبقۂ اول کے درجہ کی نہیں ہیں تاہم ان کے مرتبین نے اپنے شرائط کے تحت تساہل سے بہرحال کام نہیں لیا ہے۔ طبقۂ اول کے برعکس ان میں باریک بینی اور ضبط کی کمی ہے۔ متاخرین نے ان کے جزوی ضعف کے باوصف انہیں قبولِ عام کی سند دے دی اور ان سے علمِ دین کے اخذ کا کام لیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی احادیثِ نبوی دیگر کتابوں میں جستہ جستہ ملتی ہیں جو محدثین کے کڑے معیارِ تحقیق کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں، لیکن ان کی حیثیت منتشر موتیوں کی سی ہے جن سے ماہرینِ فن ہی کماحقہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہمارے محدثین ان صحاحِ ستہ اور مؤطا امام مالک کو حدیث کی اصل اور بنیادی کتب قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب اپنی ایک الگ حیثیت کی مالک اور اپنی جداگانہ خصوصیات کی حامل ہے۔

تدبرِ حدیث کا فطری طریقہ :

حدیث سے صحیح معنوں میں فیض یاب ہونے کے لیے تدبرِ حدیث لازمی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ حدیث پر غور و فکر کا فطری طریقہ کیا ہے۔ یہ بات بالکل غیر منطقی معلوم ہوتی ہے کہ آدمی جہاں سے چاہے اپنے غور و فکر اور تدبر کا آغاز کر دے۔ اس سے تمام سعی برباد جاتی ہے اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی مثال لیجیے۔ اس کی تفسیریں تو بے شمار ہیں۔ لیکن اصولی اور بنیادی اہمیت صرف تین تفسیروں کو حاصل ہے۔ یعنی تفسیرِ ابن جریر، تفسیرِ کشاف اور تفسیرِ کبیر۔ باقی تفسیریں یا تو ان کے تتبع میں لکھی گئی ہیں یا ان سے خوشہ چینی کے نتیجہ میں ظہور میں آئی ہیں۔ چنانچہ ہمارے خیال میں تدبرِ حدیث کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس فن کی چند امہات کا انتخاب کر لیا جائے اور ان پر پورے استقصاء کے ساتھ اس طرح غور کیا جائے کہ ان کی ہر بات اچھی طرح گرفت میں آ جائے اور اگر ان کی کچھ باتیں شک پیدا کرنے والی ہوں تو وہ بالکل متعین ہو کر سامنے آ جائیں۔ ان کی مشکلات حل کرنے کے لیے احادیث کے پورے قابلِ اعتماد ذخیرے میں سے،

جہاں جہاں سے بھی کوئی رہنمائی ملنے کا مظنّہ ہو، مواد فراہم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ اس باب سے متعلق تمام منتشر مواد اکٹھا ہو جائے اور حدیث کی جو چیزیں حدیث کے فہم میں مددگار ہو سکتی ہیں ان کی تلاش و فراہمی میں حتی الامکان کوئی کسر نہ رہ جائے۔ اور یوں ایسی احادیث پر اس وقت تک غور و فکر جاری رکھا جائے جب تک نفیاً یا اثباتاً کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔ یہ چیزیں تحقیق میں معین بھی ہوں گی اور اس سے پورا ذخیرۂ احادیث نظروں میں بھی رہے گا۔

حدیث کی امہاتِ کتب :

کسی فن کی امہات کے معنی یہ ہیں کہ اس فن میں جن کتابوں کو مرکزی اور اصولی حیثیت حاصل ہے۔ جو گویا اس فن کی تمام کتابوں کی ماں ہیں کہ جن کے بغیر کام ہو نہیں سکتا۔ ان کا نظر انداز کرنا قطعی ناممکن ہوتا ہے۔ ان کا مقام یہ ہوتا ہے کہ ان کو منتخب کر لینے اور پوری طرح سمجھ لینے کے بعد یہ توقع کی جاتی ہے کہ کام کا صحیح راستہ مل گیا ہے۔ چنانچہ کسی فن کی امہات کو منتخب کرنا، ان کو پڑھنا، ان کا سمجھنا اور ان پر وقت صرف کرنا از بس ضروری ہے۔ انتخاب کا یہ حق صرف انہی لوگوں کو دیا جا سکتا ہے جن کو اس فن میں دخل ہے اور جن کو اس کی مہارت ہے۔

اس مقصد کے لیے مرکزی اہمیت کن کتابوں کو دی جائے؟ اس سوال کے جواب میں اختلافات ہو سکتے ہیں۔ کسی کی رائے کچھ ہو سکتی ہے تو کسی کی رائے کچھ۔ بہرحال عمر بھر کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ حدیث کی امہات تین ہیں:

(۱) مؤطا امام مالک۔
(۲) صحیح امام بخاری اور
(۳) صحیح امام مسلم۔

ہمارے نزدیک اگر کسی کی ان تینوں پر تدبر کی نظر ہے تو گویا اس کی حدیث کے اصل بنیادی ذخیرے پر نظر ہے۔ ان تینوں کا حقیقی مطالعہ حدیث کے طالبِ علم کو بہت بڑی حد تک اس فن کی اس قبیل کی دیگر چیزوں سے مستغنی کر دیتا ہے۔

ان چیزوں کو اس طرح پڑھیے کہ ان کی ہر چیز آپ کے سامنے آ جائے۔ آپ بخوبی یہ جان جائیں کہ ان کی کیا مشکلات ہیں، ان سے کیا سوالات پیدا ہوتے ہیں، کیا روایتیں ایسی ہیں کہ جو بالکل واضح طریقے سے دل نشین ہو جاتی ہیں اور کیا روایتیں ایسی ہیں کہ جو دل میں کھٹک اور شبہ پیدا کرتی ہیں۔ یعنی ان کے اوپر گویا آپ کا نشان ہو گیا ہے۔ اس لیے ان پر غور کرنا اور رائے قائم کرنا ہے۔ اس طرح سے بعض جگہیں گویا ایسی معین ہو جائیں

گی کہ جہاں ڈیرہ ڈالنا پڑے گا اور گہری کھدائی کرنا پڑے گی۔ اس مقصد کے لیے بڑی وسیع تحقیقات کی ضرورت پیش آئے گی اس وقت اس چیز کی تلاش کے لیے سارا ذخیرۂ احادیث آپ کی جولانگاہ بنے گا۔ مطالعۂ حدیث میں اصل مرکزِ نگاہ یہی چیزیں ہیں۔ مثلاً

فرض کر لیجیے کہ آپ کو اپنے مطالعہ کے دوران میں ایک روایت ملی اور اس میں بڑی کھٹک پیدا ہوتی ہے۔ اب اُس مضمون کی روایت کا جہاں جہاں مظنّہ ہو کہ کہاں کہاں مل سکتی ہے اس کی تلاش کرنا پڑے گی اور پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ روایت کن کن طریقوں سے آئی ہے، کن راویوں سے آئی ہے، کن لفظوں میں آئی ہے۔ اِس میں اور اُس میں کیا کیا فرق ہے اور اس کے سمجھنے میں اس سے کس حد تک مدد مل سکتی ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اتنی محدود چیز کو سامنے رکھ کر کے پورے ذخیرۂ احادیث پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنی پڑتی ہے۔ اس طریقہ سے حدیث کی تمام کتابیں گرفت میں آجاتی ہیں اور آپ بخوبی یہ جان جاتے ہیں کہ کون کس پہلو سے کام آنے والی چیز ہے اور یوں کچھ عرصے کے بعد آپ۔ اپنے مطالعہ کی روشنی میں جان جائیں گے کہ کس کتاب کی کیا قدر و قیمت ہے۔

ان تینوں اُمّہاتِ فن کے بارے میں ایک جامع وجہ ترجیح تو یہ ہے کہ امت نے ہر دور میں ان کو حدیث کی دوسری کتابوں پر فی الجملہ ترجیح دی ہے۔ اور یہ ترجیح جو اعترافِ عظمت اور شہرت کی شکل میں ملی ہے کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے، بلکہ اس کے کچھ معقول اسباب ہیں جن میں سے بعض باتیں ہم بیان کرتے ہیں۔ اس سے ان کی امتیازی شان واضح ہوگی۔

مُوطّا امام مالک کی امتیازی خصوصیات :

سب سے پہلے مؤطا امام مالک کو لیجیے۔ حدیث کی جمع و ترتیب کے سلسلے میں پہلی جو کامیاب کوشش ہوئی اور جسے شہرتِ دوام حاصل ہوئی وہ مؤطا امام مالک ہے۔ یہ امام ابوعبداللہ مالک بن انس بن عامر رحمۃ اللہ علیہ (۹۳ھ ——— ۱۷۹ھ) کی تدوین ہے۔ جو امام اہلِ مدینہ ہیں۔ انہوں نے ایک لاکھ احادیث سے صحیح حدیثیں منتخب کر کے اپنی مؤطا کو ترتیب دیا تھا جو کم و بیش ایک ہزار روایات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اس کتاب کی ترتیب میں چالیس سال کا طویل عرصہ صرف فرمایا۔ وہ جب اس عظیم خدمت سے فارغ ہوئے تو انہوں نے مدینہ منورہ کے ستر جید فقہاء کو یہ کتاب دکھائی۔

امام شافعی علیہ الرحمۃ جیسے جلیل القدر امام حدیث و فقہ کا ارشاد ہے کہ آسمان کے نیچے کتاب اللہ کے بعد کوئی کتاب مؤطا امام مالک سے زیادہ صحیح نہیں ہے۔

امام مالکؒ سے ایک ہزار سے زائد تلامذہ نے یہ کتاب روایت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نسخوں میں

اختلاف پیدا ہوگیا۔ اس کے تمام نسخوں کی تعداد تیس ہے جن میں سے بیس زیادہ مشہور ہیں۔ یحییٰ بن یحییٰ لیثی اندلسی مصمودی کی روایت سب سے زیادہ مشہور ہے۔

حدیث کے باب میں ان کے قائم کردہ اصول جن کا التزام انہوں نے برابر کیا ہے، ہمارے نزدیک نہایت قابلِ اعتماد ہیں جس سے ان کی کتاب کا رنگ بالکل مختلف ہوگیا ہے۔ ان کی احتیاطوں کی شان کتاب کے مطالعہ کے دوران محسوس ہوتی ہے۔

اس کتاب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مختصر اور جامع ہے۔ اس فن کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں مختصر ہونے کے باوجود اس کی جامعیت کی شان پوری طرح قائم رہتی ہے اور تمام ضروری موضوعات کا پوری طرح احاطہ ہو جاتا ہے۔

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ امام مالکؒ روایت بالمعنیٰ کے معاملہ میں نہایت محتاط ہیں۔ انہوں نے روایت بالمعنیٰ کے بارے میں ایک معتدل اور متوسط زاویۂ نگاہ اختیار کیا ہے۔ وہ کم از کم قولِ رسول کے حد تک روایت بالمعنیٰ کی اجازت نہیں دیتے، بلکہ روایت باللفظ پر اصرار کرتے ہیں۔ یعنی وہ مرفوع احادیث کی روایت بالمعنیٰ کو ناروا اور غیر مرفوع احادیث کی روایت بالمعنی کو روا قرار دیتے ہیں۔ مرفوع احادیث میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ با، تا اور یا تک کا خیال رکھتے تھے۔

اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ امام مالکؒ اصحابِ بدعت سے روایت لینے کے معاملے میں دوسرے ائمہ حدیث کے مقابل میں زیادہ محتاط بلکہ متشدد ہیں۔ وہ اس طرح کی کوئی قید نہیں لگاتے کہ وہ اپنے عقیدہ و مسلک کا داعی ہو یا نہ ہو۔ وہ بطورِ اصول اہلِ بدعت سے روایت نہیں لیتے۔

اس کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ادبی معیار بہت ہی اونچا ہے۔ اس میں صدرِ اوّل کی خالص اور نہایت فصیح و بلیغ زبان پڑھنے کو ملتی ہے۔ جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے حدیث کے سمجھنے کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔

یہاں اس امر کا بیان بھی ضروری ہے کہ مؤطا میں چور دروازے سے آنے والی بعض روایتوں کی نوعیت بہرحال استثنائی ہے اس لیے کہ اس کتاب کی روایت، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، متعدد واسطوں سے ہے تو اس میں کسی اصل بے جوڑ چیز کا گھسا دینا کوئی بعید بات نہیں ہے۔ بہرحال صاحبِ ذوق اسے بڑی آسانی سے نشان زد کر لیتا ہے۔ یہ کام چنداں مشکل نہیں ہے۔

مزید برآں یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کتاب کے لکھوانے میں بعض عباسی خلفاء کی اس مبارک خواہش کا خاص دخل رہا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہو جو امت کے اندر فقہی اختلافات کی بڑھتی ہوئی رَو کو

ہو سکتے ہیں کارگر ثابت نہ ہو۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری میں جب مسلمانوں کے فقہی اختلافات بہت بڑھ گئے تو اس صورت حال سے متاثر ہو کر وقت کے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے جب کہ وہ ۱۴۸ھ میں حج کے لیے گیا امام مالکؒ سے فرمائش کی کہ امت میں اختلافات فقہی بہت بڑھتے جا رہے ہیں اور فساد برپا ہو رہا ہے اور اگر آپ اجازت دیں تو میں تمام مسلمانوں کو امام موصوف کی فقہ پر مجتمع ہونے کے لیے تمام مملکت اسلامیہ میں حکم جاری کر دوں۔ لیکن امام مالکؒ نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور فرمایا کہ ہر گروہ کے اسلاف اور ائمہ الگ الگ ہیں۔ اس لیے اگر امیر المومنین ان کو موجودہ حال ہی پر چھوڑ دیں تو یہ بہتر ہے۔ ابوجعفر منصور امام مالک کے اس جواب کے بعد اس وقت تو خاموش ہو گیا، لیکن اس کا خیال برابر قائم رہا کہ امام مالکؒ کے ہاتھوں اسلامی قانون مدون ہو جائے۔ چنانچہ ۱۶۳ھ میں جب وہ پھر حج کے لیے گیا تو اس نے اپنی سابق تجویز امام صاحب کے سامنے نہایت تفصیل اور پورے زور و قوت کے ساتھ رکھی اور تدوین قانون سے متعلق اس نے اپنا نقطۂ نظر بھی ان الفاظ میں پیش کر دیا: "اے ابو عبد اللہ (امام مالک کی کنیت ہے) آپ علم فقہ کو ہاتھ میں لیجیے اور اس کو الگ الگ ابواب کی صورت میں مدون کر ڈالیے ـــ عبد اللہ بن عمرؓ کے تشددات، عبد اللہ بن عباسؓ کی رخصتوں اور عبد اللہ بن مسعودؓ کی انفرادیات سے بچتے ہوئے ایک ایسا ضابطہ مدون کیجیے جو "خیر الامور اوسطہا" کے اصول پر مبنی ہو اور جو ائمہ اور صحابہؓ کے متفق علیہ مسائل کا مجموعہ ہو۔ اگر آپ نے یہ خدمت انجام دے دی تو ان شاء اللہ آپ کی فقہ پر ہم مسلمانوں کو مجتمع کر دیں گے، اور اس کو تمام مملکت کے اندر جاری کر کے اعلان کر دیں گے کہ کسی حال میں اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے"۔ کہا جاتا ہے کہ امام مالکؒ نے اس کی اس خواہش کو مد نظر رکھ کر موطا مرتب کی، لیکن وہ اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ موطا کو پوری مملکت کے لیے اسلامی قانون کی حیثیت دے دی جائے۔ تاریخوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہی خواہش اپنے زمانہ میں ایک دوسرے عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے بھی امام صاحب کے سامنے پیش کی تھی، لیکن انہوں نے اس کی خواہش بھی مسترد کر دی۔

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب حکومت کی خواہش سے گریز کر گئے لیکن فی الحقیقت اس تحریک سے متاثر ہو کر انہوں نے موطا مرتب کر کے امت کی ایک عظیم خدمت انجام دے دی جس میں اس اصول کو پیش نظر رکھا کہ امت کے فقہی اختلافات کم ہوں اور یہ چیز اس کے لیے فی الجملہ جامع ہو۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ (۱۷۰۳ء ـــ ۱۷۶۳ء) نے اپنے زمانے میں حدیث کی جو خدمت کی اس میں موطا امام مالک کو بڑی اہمیت دی۔ اس کتاب کا غالباً یہی پہلو ہے جس کی بنا پر شاہ صاحب نے نہایت اہتمام سے اپنے وقت کی عالم اسلام کی سب سے بڑی دو زبانوں یعنی عربی اور فارسی میں الگ الگ شرح لکھی۔ شاہ صاحب

کے افکار پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ فقہی اختلافات کے طبعی نقصانات سے امت کو محفوظ کرنے کے لیے انہوں نے بڑا قلمی جہاد کیا ہے۔ ان کا خاص مشن یہ تھا کہ امت کے اختلافات کو دور کرنے کے لیے فقہ اسلامی کو ایسے راستے پر لایا جائے کہ اس کے اختلافات دور ہوں۔ یہ ایک خاص فکر تھا جو ان کے سامنے تھا اور اس طرح انہوں نے امام مالکؒ کی تحریک کو اپنے دور میں آگے بڑھایا۔ شاہ صاحب ہی سے متاثر ہو کر اس موضوع پر ہم نے اپنی کتاب 'اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل' لکھی۔

صحیحین کا مرتبہ و مقام:

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے متعلق یہ بات مشہور عوام و خواص ہے کہ ان دونوں کتابوں میں جو چند ہزار حدیثیں لی گئی ہیں وہ لاکھوں حدیثوں کے انبار میں سے چھانٹ کر لی گئی ہیں۔ ذرا اندازہ کیجیے ان عظیم خادمان حدیث کی اس محنت شاقہ کا جو رطب و یابس روایات کے انبار میں سے ان چند ہزار جواہر ریزوں کو چھانٹنے میں ان کو برداشت کرنی پڑی ہوگی۔ ان کی اس جاں گداز محنت ہی کی بدولت آپ کو یہ روایات ان کتابوں میں اس شکل میں ملتی ہیں کہ ثقہ کی ثقہ سے روایت کے زینے چڑھتے ہوئے آپ بغیر کسی شائبۂ ارسال و انقطاع اور بدون کسی اندیشۂ تدلیس کے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ قدس تک پہنچ جاتے ہیں۔

بہرحال ان اماموں کی خدمت کی داد دیجیے۔ ان کی یہ خدمت اتنی بڑی ہے کہ ہم ان کے سامنے گردن نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے معیار صحت کی بنیاد پر امت نے صحیحین کو یہ درجہ دیا ہے کہ ان کا مقام صدر اول سے فن حدیث کی امہات کے طور پر رہا ہے اور یہ مقام موطا امام مالک کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ ان کے بعد اگر کچھ اور لوگوں نے بھی کام کیا ہے تو انہی کی اتباع میں کیا ہے۔

یہاں اس امر کا بیان بھی ضروری ہے کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے ایسی تمام احادیث کا ذکر کرنے کا التزام نہیں کیا جن کو محدثین کی اصطلاح میں صحیح سمجھا جاتا ہے۔ معدودے چند احادیث ایسی ہیں جن کی صحت کا اعتراف کرنے کے باوجود امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے انہیں اپنی کتابوں میں ذکر نہیں کیا وہ یا تو سنن اربعہ میں مذکور ہیں یا دیگر کتب حدیث میں جن کو صحیح تصور کیا جاتا ہے۔

امت کے ایک گروہ نے صحیح بخاری کو ترجیح دی ہے اور دوسرے نے صحیح مسلم کو۔ صحیح بخاری کو ترجیح دینے والے زیادہ ہیں، لیکن مغاربہ نے صحیح مسلم کو ترجیح دی ہے۔ ہماری رائے میں ان دونوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے اور دونوں کی خوبیاں الگ الگ ہیں۔ یہ چنداں ضروری نہیں ہے کہ ایک کو دوسری پر لازماً ترجیح دی جائے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر ترجیح حاصل ہے جیسا کہ ہم آگے مفصل بیان کریں گے۔

صحیح امام بخاری کی امتیازی خصوصیات :

صحیح امام بخاری، حدیث کے جلیل القدر امام، ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۴ھ ــــــ ۲۵۶ھ) کا عظیم کارنامہ ہے۔ انہوں نے اسے تقریباً پانچ لاکھ حدیثوں کے انبار سے مدوّن کیا۔ انہوں نے اپنی کتاب کی ترتیب و تہذیب میں سولہ سال صرف کیے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک ہزار سے زیادہ شیوخِ حدیث سے استفادہ کیا۔ ستر ہزار طلبہ نے امام بخاری سے ان کی صحیح کا درس لیا۔

صحیح بخاری کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا معیارِ سند موطا کے سوا سارے ذخیرۂ احادیث میں سب سے عالی ہے۔ سند کے معاملے میں امام بخاریؒ کی احتیاط اپنے نقطۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ انہوں نے روایتِ حدیث میں دو شرطیں مقرر کی ہیں: ایک یہ کہ حدیث کا راوی اپنے شیخ کا معاصر ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کا سماع بھی ثابت ہو۔ اس کے برعکس امام مسلمؒ معاصرت کو لقاء کے لیے کافی سمجھتے ہیں اور سماع کو ضروری خیال نہیں فرماتے۔ یعنی اگر ایک راوی دوسرے راوی کا معاصر ہے تو امام مسلمؒ اس کی ملاقات بدون کسی اور دلیل کے مان لیں گے جب کہ امام بخاریؒ اس وقت تک نہیں مانتے جب تک ایک کی ملاقات دوسرے سے ثابت نہ ہو۔ ان کو اس معاملے میں اتنا ابرام ہے کہ انہوں نے نہایت سخت الفاظ میں، اپنی صحیح کے مقدمے میں، امام بخاریؒ کے اس موقف پر تنقید کی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ ساری بحث پورے غور و فکر کے ساتھ پڑھنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ امام مسلمؒ نے جس شد و مد کے ساتھ لکھا ہے ان کی بات اتنی قوی نہیں ہے۔ امام بخاریؒ کی بات زیادہ قوی، زیادہ محتاط اور زیادہ مدلل معلوم ہوتی ہے۔

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے باوجود ایک ہزار سے زیادہ شیوخِ حدیث سے اخذ و استفادہ کے صرف انہی محدثین کی روایتیں منتخب کیں جو ایمان کو قول و عمل کا مجموعہ قرار دیتے تھے۔ اسی وجہ سے کلامی اعتبار سے کتاب کی شان نہایت نمایاں ہے اور اس کے بغور مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب کے وقت یہ پہلو بھی پوری طرح سے ان کے پیشِ نظر رہا ہے کہ مرجئہ اور ان کے جتنے ہم مشرب گروہ ان کے زمانے میں تھے اور انہوں نے جو فتنے ان دنوں اٹھائے تھے ان کا قلع قمع کیا جائے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ آج بھی کلامی اعتبار سے مرجئہ ہی کا مذہب اسلامی دنیا میں عملاً رائج ہے اور عمل کی وقعت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ دین و شریعت کے چند ظاہری رسمی یا ساری نجات کے لیے کافی سمجھی جاتی ہے۔ جب کہ اصل یہ ہے کہ ایمان بے معنیٰ ہے اگر اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ وہ ایمان جس کے ساتھ عمل نہیں ہے اس کی دینِ اسلام میں کوئی وقعت اور قدر و قیمت نہیں۔ ایسا ایمان بالکل ٹھونٹھ درخت کے مانند ہے جس میں عمل کے برگ و بار پیدا ہی نہیں ہوتے۔ عمل ہی سے ایمان زندہ ہوتا، جڑ پکڑتا اور قوت پاتا ہے اور یہ عمل ہی ہے

جو انسان کو عنداللہ مقبولیت، عظمت اور رفعت بخشتا ہے۔ اپنی کتاب میں امام بخاریؒ نے دین کی اس حقیقت کو پوری طرح سے واضح فرمایا۔

اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی صحیح کے عنوانات ایک خاص طریقے سے مرتب کیے ہیں جس سے ان کی وسعتِ علم اور تفقہ فی الدین کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی وجہ سے تربیتِ فکر کے پہلو سے اس کا درجہ بڑا اونچا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ یہ دماغ کو جھنجھوڑتی اور غور کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس لیے تفہیمِ دین کے لیے یہ نہایت اہم ہے۔

صحیح امام مسلم کی امتیازی خصوصیات :

صحیح امام مسلم، حدیث کے عالی مقام امام، ابوالحسین مسلم بن حجاج بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ (۲۰۶ھ ــــــ ۲۶۱ھ) کی شاندار تالیف ہے۔ انہوں نے تین لاکھ احادیث سن کر ان میں سے اس کو مرتب فرمایا تھا۔ امام مسلمؒ کو بجا طور پر اپنی کتاب پر بڑا ناز تھا کیونکہ اس کی ترتیب و تہذیب میں انہوں نے حد درجہ کاوش اور عرق ریزی سے کام لیا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر محدثین دو سو سال تک بھی حدیثیں لکھتے رہیں تو ان کا انحصار و مدار صحیح مسلم ہی پر ہوگا، اور میں نے کوئی حدیث اس کتاب میں بغیر دلیل قائم کیے بغیر نہ داخل کی ہے اور نہ موجود ذخیرۂ حدیث سے اس کے بغیر نکالی ہے۔

صحیح مسلم کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ امام مسلمؒ نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ عموماً وہی حدیث نقل کرتے ہیں جس کو دو ثقہ تابعیوں نے دو صحابیوں سے روایت کیا ہو اور اسی طرح ہر طبقہ میں دو ثقہ یعنی معتبر شخص دو شخصوں سے روایت کرتے آئے ہوں جب کہ امام بخاریؒ نے اس شرط کا خیال نہیں رکھا ہے۔

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حدیث پر غور کرنے کے لیے اس کی ترتیب سب سے زیادہ سائنٹیفک ہے۔ انہوں نے احادیث کو ایک خاص طریقہ سے مرتب کیا ہے۔ انہوں نے ہر ایک حدیث کے لیے ایک خاص مقام، جو مناسب تھا، مقرر کیا ہے اور وہیں اس روایت کے تمام طریقوں کو جمع کر دیا ہے اور نیز یہ کہ اس کے مختلف الفاظ کو ایک ہی مقام پر بیان کیا ہے تاکہ قاری کو آسانی ہو اور اس کے لیے تمام طرق سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو۔ اس کے برعکس امام بخاریؒ کا طریقہ مختلف ہے۔ وہ کسی حدیث کے مختلف طرق کو متفرق و متباعد ابواب میں ذکر کرتے ہیں جس سے حدیث کے طالب علم کے لیے مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ان روایات کے بارے میں جن کے متعلق آپ کو شکوک و شبہات ہوں گے صحیح مسلم سے جو مدد ملے گی وہ دوسری کتابوں سے نہیں ملے گی۔ اسی لیے یہ کتاب، فہمِ حدیث کے مقصد سے، ممتاز ترین ہے۔

اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ امام مسلمؒ رواۃ حدیث کے الفاظ ضبط کر دیتے ہیں۔ مثلاً یوں کہتے ہیں

کہ "حدثنا فلان وفلان واللفظ لفلان، قال او قالا حدثنا فلان"۔ اسی طرح جب راویانِ حدیث کے درمیان متنِ حدیث کے ایک حرف یا راوی کی کسی صفت یا نسبت یا کسی اور بات میں اختلاف ہو تو امام مسلمؒ اس کو ذکر کر دیتے ہیں اگرچہ وہ صرف اتنا معمولی ہو کہ اس کی تبدیلی سے معنی میں کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ اس سے ان کی امانت و دیانت اور حفظ و ضبط کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ الفاظ سے ایک صاحبِ ذوق کو یہ اندازہ کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ اس حدیث کے راویوں میں سے کون راوی صدرِ اوّل کی زبان کو زیادہ محفوظ رکھنے والا ہے۔

امام مسلمؒ کے متعلق یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ وہ اصحابِ بدعت سے روایت لینے میں متہم ہیں اور ایسا کم تر درجے میں امام بخاریؒ کے متعلق بھی ہے۔ یہ علم بعض مشکل روایات کی توجیہ کے وقت مفید ہو سکتا ہے۔

خلاصۂ بحث:

ان تینوں کتابوں میں، جو امہاتِ فن کے درجے پر فائز ہیں، ہمارے خیال میں احادیثِ رسول کا اتنا ذخیرہ موجود ہے جو پورے نظامِ دین کو متشکل کر دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ ان سے باہر کی کسی حدیث سے آپ کو ان کی کسی حدیث کی توضیح و توجیہ میں کوئی مدد مل جائے، لیکن دین کی تشریح کے معاملہ میں آپ ان سے باہر کی کسی چیز کے بہت بڑی حد تک محتاج نہیں رہیں گے۔ دین کے نظام کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کے ساتھ مل کر یہ چیزیں ان شاءاللہ کافی ہوں گی۔ حدیث کی کوئی دوسری کتاب ان کی قائم مقام نہیں ہو سکتی۔

ان تینوں کتابوں پر اچھی طرح عبور حاصل کرنے کے بعد اس فن کی دوسری کتابوں کے غث و سمین سے عہدہ برآ ہونے میں آدمی کو کوئی زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔ ان تینوں امہاتِ فن کے محقق کے لیے حدیث کی بقیہ کتابوں کا سرسری مطالعہ بھی مفید اور کافی ہو گا۔

تدبرِ حدیث کے خواہاں، حدیث کے طالب علم کو اپنی نگاہ کو اچھی طرح بیدار رکھنا ہو گا۔ بیداری کی یہ شرط تدبرِ حدیث کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ کسی بھی علم و فن کے لیے۔ ہمارے قابلِ فخر محدثین نے حدیث پر تحقیق اور علومِ حدیث کی تدوین کا عظیم کارنامہ اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے کمال حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ انہیں کے قائم کردہ اصولوں اور مزید فطری اصولوں کی رہنمائی میں اسے آگے ترقی دی جا سکتی ہے۔ پس آدمی کا فرض ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس مغالطہ میں مبتلا نہ ہو کہ تحقیق و تنقید کا کام ہمارے اسلاف کر گئے ہیں، اب ہمیں صرف حدیث کا دورہ کرنا ہے۔ بلکہ اس کا مشن یہ ہونا چاہیے کہ تحقیقِ حق کے لیے اسے بھی ان کی اس عظیم علمی تحریک کو آگے بڑھانا ہے۔

(ترتیب: ماجد خاور)

خالد مسعود

ستاروں کی تاثیر کا عقیدہ

عن زید بن خالد الجهني قال صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم صلاة الصبح بالحديبية على اثر السماء كانت من الليل فلما انصرف اقبل على الناس فقال هل تدرون ماذا قال ربكم قالوا الله ورسوله اعلم قال قال اصبح من عبادي مومن بي وكافر فاما من قال مطرنا بفضل الله ورحمته فذلك مومن بي كافر بالكوكب واما من قال مطرنا بنوء كذا وكذا فذلك كافر بي مومن بالكوكب۔

"زید بن خالد جہنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حدیبیہ کے مقام پر رات بارش ہونے کے بعد فجر کی نماز پڑھائی۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو نمازیوں کی طرف رخ کیا اور پوچھا: جانتے ہو تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ کہ میرے بعض بندے مجھ پر ایمان لانے والے بنے اور بعض کفر کرنے والے۔ جن لوگوں نے یہ کہا کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہم پر بارش ہوئی وہ تو مجھ پر ایمان لانے والے اور ستاروں کا انکار کرنے والے ہوئے۔ پر جن لوگوں نے یہ کہا کہ فلاں نچھتر برسی تو وہ میرا انکار کرنے والے اور ستاروں پر ایمان لانے والے بنے۔"

یہ روایت اصلاً مؤطا امام مالکؒ کی ہے جسے امام مسلمؒ نے کتاب الایمان باب کفر من قال مطرنا بالنوء میں اور امام بخاریؒ نے باب الاذان، باب الاستسقاء اور باب غزوۃ الحدیبیہ میں بیان کیا ہے۔ اس کے واحد راوی حضرت زید بن خالدؓ ہیں اور انہی کی روایت مفصل ہے۔ مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی یہ روایت نقل کی ہے جو مضمون میں مشترک ہے لیکن اس میں وہ تفصیل نہیں جو زید بن خالدؓ کی روایت

میں ہے۔ لہذا زید بن خالدؓ ہی کی روایت اس مسئلہ میں اصل روایت ہے۔

وضاحتِ حدیث:

'سماء' کا لفظ جس طرح آسمان کے لیے آتا ہے اسی طرح یہ بارش کے لیے بھی معروف ہے۔

'نوء' ناء ینوء سے ہے جس کے معنی 'بمشکل اٹھنا' ہیں۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن مجید میں سورۃ القصص آیت ۷۶ میں آیا ہے۔ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ یعنی قارون کے خزانوں کی کنجیاں ایک طاقت ور جماعت سے بمشکل اٹھتی تھیں۔ جب ستارہ افق سے اٹھتا اور مطلع پر نمودار ہوتا ہے تو اس کے طلوع کے لیے بھی 'نوء' کا لفظ آتا ہے۔ یہیں سے یہ لفظ آسمان پر ستاروں کی منزلوں کے لیے استعمال ہونے لگا کیونکہ ہر منزل کا تعین کسی خاص ستارہ کے طلوع ہونے سے کیا جاتا۔ یہ منزلیں ہندی فلکیات میں نچھتر کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں۔

روایت میں جس واقعہ کا بیان ہے معلوم ہوتا ہے یہ صلح حدیبیہ کے ایام میں پیش آیا۔ رات بارش ہوئی۔ صبح لوگ نماز فجر کے لیے جمع ہوئے تو نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس حقیقت سے آگاہ فرمایا کہ بارش اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوتی ہے۔ جو لوگ اس کو ستاروں اور نچھتروں کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ خدا پر ایمان کے منافی بات کرتے ہیں۔ ان کا عمل ستارہ پرستوں کا عمل ہے۔ خدا کے باایمان بندے بارش کو اللہ ہی کا فضل سمجھتے ہیں۔ وہ ستاروں اور نچھتروں کی تاثیر کے قائل نہیں ہوتے۔

روایت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے بارش کو نچھتروں کی طرف منسوب کیا تو آنحضرتؐ نے اس پر یہ تنبیہ فرمائی۔ اگرچہ اس طرح کے مواقع پر لوگوں کی زبان پر مشہور عوام طرز تعبیر کا آجانا بعید نہیں ہوتا لیکن زیادہ قرین قیاس یہ بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو بارش سے متعلق ایک مشرکانہ عقیدہ سے بر سر موقع خبردار کیا ہوگا تاکہ ان کی تربیت ہو اور وہ اس طرح کی باتوں کو سہل انگاری سے نہ لیں اور مشرکانہ تعبیروں کو زبان پر نہ لائیں۔ آپ کی عادت یہ تھی کہ صحابہ کی تعلیم و تربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے اور دین کے رموز سے برابر انہیں آگاہ فرماتے رہتے۔

ستاروں کی تاثیر کا تصور:

نچھتروں کو کواکب پرستوں اور مشرکین کے ہاں ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ انہوں نے نہ صرف ان کو زمینی معاملات میں مؤثر گردانا بلکہ ان کے ساتھ دیوی دیوتاؤں کے تصورات بھی منسلک کر لیے۔ ماہرین عمرانیات

اس کی توجیہہ یوں کرتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں انسان نے یہ دیکھا کہ اس کی زندگی پر اثر انداز ہونے والی بہت سی اشیاء کا تعلق آسمان سے ہے۔ سورج روشنی اور حرارت مہیا کرتا ہے۔ چاند خنک روشنی فراہم کرتا ہے، ستارے رات بھر جگ مگ کرتے اور ایک خاص رخ پر برابر سفر کرتے ہیں۔ بادل فضا میں بنتے اور بارش لاتے ہیں۔ بعض ستارے اس سے آزاد ہیں کہ وہ کسی خاص ہیئت ہی میں ہمیشہ رہیں بلکہ وہ اپنی جگہ برابر بدلتے رہتے ہیں۔ اس پر انسان نے یہ سوچا کہ ہو نہ ہو عالم بالا میں اصل قوت یہ شمس و قمر اور ثوابت و سیارے ہی ہیں۔

جب انسان نے آسمان کا مزید مشاہدہ کیا تو اسے ستاروں کی مختلف ہیئتیں نظر آئیں جن کے پس منظر میں کبھی سورج گزرتا کبھی چاند۔ اس نے دیکھا کہ ان ہیئتوں کے ساتھ موسموں کا تغیر و تبدل وابستہ ہے۔ اس نے اپنی معلومات کو منضبط کرنے کے لیے ستاروں کی بارہ ہیئتیں یا منزلیں متعین کیں جن میں سے گزر کر سورج کا ایک چکر مکمل ہوتا۔ اس طرح سال کے بارہ مہینے وجود میں آئے۔ اسی طرح اس نے چاند کی حرکت کو منضبط کرنے کے لیے ستاروں کی ۲۸ منزلیں مقرر کیں، ستائیس ۱۳ دن کی اور ایک ۱۴ دن کی۔ اس طرح شمسی سال کے پورے دن حساب میں آگئے۔ یہ منزلیں نچھتر کہلائیں۔

جب موسموں کے تغیر و تبدل، سردی، گرمی، برسات وغیرہ کو اجرام فلکی کی تاثیر مان لیا گیا تو مشرکانہ ذہن نے ان کے ساتھ دیوی دیوتا وابستہ کر لیے اور ان کی پوجا ہونے لگی۔ کوئی ستارہ زرخیزی کا دیوتا ٹھہرا تو کوئی زور و قوت کا۔ کسی کی طرف محبت منسوب کی گئی اور کسی کی طرف دولت۔ اسی بنیاد پر علم نجوم وضع کر لیا گیا جس میں ستاروں اور شمس و قمر کی پوزیشنیں معلوم کر کے یہ قیاس آرائی کی جاتی کہ فلاں گھڑی میں کسی کام پر کس کس ستارے کے اثرات پڑ رہے ہیں اور اس کی تاثیر کیا ہو سکتی ہے۔ اجرام فلکی میں سے بعض کو نحس اور بعض کو سعد قرار دے کر مستقبل کے بارے میں رائے زنی کی جاتی۔ اس زمانہ میں اگرچہ انسان کی معلومات میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے اور وہ اجرام فلکی کی ماہیت سے واقف ہو چکا ہے لیکن اس قدیم دیومالائی نظام میں اتنی کشش ہے کہ جدید دور کی عقلیت پسندی بھی اس کے اثرات کو محو نہیں کر سکی اور جرائد، اخبارات و رسائل آج بھی اپنے قارئین کو یہ خبر دیتے ہیں کہ آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟ اور آپ کا یہ ہفتہ کیسے گزرے گا؟

زمانہ جاہلیت کے عربوں میں ستاروں کے بارے میں مشرکانہ عقائد پائے جاتے تھے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ستارہ شعریٰ (SIRIUS) جو موسم بہار میں طلوع ہوتا ان کے ہاں خوشحالی کا ستارہ سمجھا جاتا۔ بارش کو بھی وہ بعض ستاروں یا نچھتروں سے منسوب کرتے اور یہ تعبیر اختیار کرتے کہ فلاں نچھتر کی بدولت بارش ہوئی یا فلاں نچھتر دغا دے گئی۔ اسلام نے ان تصورات کو ختم کیا اور یہ تعلیم دی کہ کائنات کا اصل مالک اور حاکم اللہ تعالیٰ ہے۔ ہر چیز اس کے تصرف میں ہے، سورج، چاند اور ستارے اس کی اہم نشانیاں ہیں۔ شعریٰ کے طلوع کے زمانہ میں

اگر خوشحالی آتی ہے تو شعریٰ کا مالک دیتا ہے۔ یہ اسی کا بنایا ہوا نظام ہے کہ تمام ثوابت و سیارے وہ فرائض سرانجام دے رہے ہیں جو خداوند نے ان کو تفویض کر دیے ہیں۔ یہ سب اس کے آگے مسخر ہیں اور اس کے حکم سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتے۔ یہ اپنے مالک کے آگے ہمیشہ سرافگندہ رہتے ہیں۔ ان کی حرکات کو اس نے زمین پر اثرات ڈالنے کا ذریعہ بنایا ہے تو یہ خداوند تعالیٰ کی منصوبہ بندی ہے نہ کہ ان ثوابت و سیاروں کی تاثیر۔ زیرِ نظر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں بارش کے موقع پر یہی تعلیم دی کہ اجرامِ فلکی کی تاثیر کا عقیدہ اسلام کے منافی ہے، مومنوں کے تغیرات کو خدا ہی کی طرف منسوب کرنا چاہیے۔ یہی ایمان باللہ کا تقاضا ہے۔

اسباب و وسائل پر انحصار:

اللہ تعالیٰ نے جس طرح اجرامِ فلکی کی حرکات اور ستاروں کی ہیئتوں کے ساتھ زمین کی کیفیات میں تغیر کو وابستہ کر دیا ہے اسی طرح وہ تمام دنیا کے کام اسباب کے پردے ہی میں کام کرتا ہے۔ بارش وہی برساتا ہے لیکن اسباب میں نم آلود ہوائیں اور بادل شامل ہوتے ہیں۔ رزق کے خزانے وہی فراہم کرتا ہے لیکن اس کے ظاہری اسباب میں زمین کی زرخیزی، کسانوں کی محنت اور فصلوں کی حفاظت نظر آتی ہے۔ انسانوں کو وجود میں لانے والا وہی ہے۔ لیکن ماں باپ کو اس نے اولاد کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ بیماری اسی کے حکم سے آتی ہے لیکن اس کے اسباب کے طور پر بعض غذائیں یا جراثیم نمایاں ہوتے ہیں۔ بیماری سے شفا وہی دیتا ہے اگرچہ بظاہر ادویات اس کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے یہ چاہتا ہے کہ ان کی نظر اسباب ہی میں الجھ کر نہ رہ جائے بلکہ وہ ان اسباب کو پیدا کرنے اور ان کو نتیجہ خیز بنانے والے خداوند تک پہنچیں۔ نعمت ملنے پر اس کا شکر بجا لائیں، اس کے احسان کے معترف ہوں اور اس کی نعمت کا چرچا کریں۔ قرآن مجید نے ہمیں انسان کی اس کمزوری سے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ جب تک وہ حقیقی احتیاج اور افتقار سے دوچار نہیں ہوتا اس کی آنکھوں پر پردہ پڑا رہتا ہے اور وہ کبھی اپنی قابلیت اور ذہانت کو اور کبھی اسباب و وسائل کو اپنی کامیابیوں میں اصل مؤثر قوت قرار دیتا ہے۔ قرآن نے اس کو شرک قرار دیا ہے۔ زیرِ نظر حدیث بھی اسی تعلیم کی حامل ہے۔

یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بارش کو نچھتروں کے ساتھ متعلق کرنا یا اسباب کو مؤثر سمجھنا کفر و شرک کی تعریف میں آتا ہے تو ہماری بہت ساری روزمرہ کی گفتگو تو اسی ذیل میں آ جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر 'نچھتروں' ستاروں یا اسباب کو بذاتہٖ مؤثر مان لیا جائے تو اس کی حیثیت ایک عقیدہ کی ہو گی جو یقیناً کفر و شرک ہی کی تعریف میں آتا ہے اور ہر بندۂ مومن کو ایسے عقیدہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہمارے روزمرہ کے بہت سے امور میں ہم عقیدہ کے طور پر نہیں بلکہ ایک عادتِ مستمرہ کے طور پر بھی بعض اسباب کا نام لیتے ہیں۔ ہمارا تجربہ یا

(باقی صفحہ ۴۱ پر)

تزکیۂ نفس

امین احسن اصلاحی

اِنسان کا تعلق اپنی ذات سے

پچھلی فصلوں میں ہم نے 'بندے اور رب کے تعلق' کے جو مقتضیات بیان کیے ہیں اگر وہ ذہن میں مستحضر ہیں تو یہ سمجھنا آپ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے کہ اپنی ذات کے ساتھ آپ کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس کی روشنی میں آپ خود، بے تکلف، اس حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں کہ آپ خالق نہیں بلکہ مخلوق ہیں؛ خدا نہیں، بلکہ بندے ہیں۔ تو لازماً آپ اپنی ذات کے معاملہ میں خود مختار اور مطلق العنان بھی نہیں ہو سکتے؛ بلکہ اخلاقاً اور عقلاً آپ پابند ہیں کہ آپ کا ہر اقدام اس خالق و پروردگار کی پسند کے مطابق ہو جس نے آپ کو وجود بخشا ہے اور جو آپ کی پرورش کر رہا ہے۔

یہ شعور یہ رہنمائی دیتا ہے کہ آپ اپنی ذات اور اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اپنے رب کی امانت تصور کریں اور اسی حیثیت سے ان کے ساتھ معاملہ کریں۔ آپ ان میں سے نہ کسی چیز کو اپنے ارادہ سے ضائع اور برباد کر سکتے، اور نہ رہن اور بیع کر سکتے اور نہ امانت رکھنے والے کی مرضی کے خلاف ان میں کوئی تصرف کر سکتے۔

خالق نے آپ کے اندر جو قوتیں اور صلاحیتیں بھی ودیعت کی ہیں وہ سب بلا استثناء آپ کے مقصدِ وجود کے لیے لازمی اور ضروری ہیں۔ کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو کاٹ پھینکنے کے لائق ہو۔ ان میں سے کوئی چیز اگر کسی برائی کا سبب بنتی ہے تو آپ کے سوءِ استعمال بنتی ہے۔ خرابی شے میں نہیں، بلکہ آپ کے طریقِ استعمال میں ہوتی ہے۔ آپ اگر اپنی قوتوں کو صحیح طریقہ پر، صحیح محل میں، استعمال کریں گے تو ان سے اپنی اور اپنی پوری نوع کی خدمت کریں گے اور غلط طریقہ، غلط محل میں، استعمال کریں گے تو اپنی دنیا اور آخرت، دونوں برباد کریں گے۔ جوگیوں اور راہبوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے جسم اور جسمانی قوتوں کو بجائے خود روح کی ترقی میں مزاحم تصور کیا اور اس تصور کے تحت اپنے جوگیانہ اور راہبانہ نظام میں ان کو ختم کرنے کے لیے جاں گسل ریاضتیں ایجاد کیں جن کے تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ حالانکہ اس طرح انہوں نے روح کی ترقی و اصلاح

کے مقصد کو کوئی فائدہ پہنچانے کے بجائے الٹا اس کو نہایت شدید نقصان پہنچایا۔ روحِ انسانی جس طرح آسمان سے غذا حاصل کرتی ہے اسی طرح زمین سے بھی غذا حاصل کرتی ہے۔ جسم کی قوتیں اگر صحیح طور پر نشو و نما پائیں اور اپنے صحیح محل میں استعمال ہوں تو ان سے روح قوت حاصل کرتی ہے۔ برعکس اس کے اگر جسم بیمار ہو تو بیمار جسم کی روح بھی مضمحل ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھیے۔ جوگیوں اور راہبوں نے انسان کی جنسی خواہش کو نہایت مہلک ٹھہرایا ہے اور روح کی آزادی اور اس کی تطہیر کے لیے اس کے قلع قمع کو لازمی بتایا ہے۔ حالانکہ جس شخص کے اندر قوتِ مردانگی نہ ہو اس کے اندر فتوت، بسالت اور شجاعت کا پایا جانا بھی ممکن نہیں ہے۔ درآنحالیکہ یہ صفتیں ایک زندہ اور بیدار روح کا اصل جمال ہیں۔ اگر کسی شخص میں یہ چیزیں نہ ہوں تو وہ نیم مردہ انسان ہے جس کے اندر بعض منفی قسم کی صوفیانہ نیکیاں تو پرورش پا سکتی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ محراب و منبر کی زینت بننے کے لیے بھی بعض اوصاف اپنے اندر پیدا کر لے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کر سکے جس کے لیے فتوت کا جوہر مطلوب ہوتا ہے۔

یہ تنبیہ میں نے اس لیے یہاں ضروری سمجھی ہے کہ اسی راہبانہ تصور کے تحت ہمارے اربابِ تصوف نے بھی روح کی تطہیر کے لیے بعض ایسے اعمال و اشغال ایجاد کیے ہیں جن کی شریعت میں اگرچہ کوئی اصل نہیں ہے، لیکن وہ ان کے زیادہ سے زیادہ اہتمام پر بہت زور دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کاموں میں جو مشقت اٹھائی جاتی ہے روح کے لیے اصلی برکت اسی کے اندر ہے۔ کھانے پینے اور لذات کی تقلیل، بلکہ ان کے ترک کے لیے وہ نہایت جاں گسل ریاضتیں کرتے ہیں اور ان کا زعم یہ ہے کہ اس سے ان کے اندر باطن کا جو نور پیدا ہوتا ہے وہ مخفی حقائق سے پردے اٹھا دیتا ہے۔

اس طرح کی کوئی چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاں ہمیں نہیں ملتی، حالانکہ روحانی پاکیزگی کے اعتبار سے ان کا جو مرتبہ ہے وہ کسی دوسرے کا نہ ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس ان کے ہاں ہر معاملہ میں اعتدال و میانہ روی کی تعلیم ملتی ہے اور اگر کسی کے کسی عمل سے اس کے اندر کسی غالیانہ رجحان کا اظہار ہوا ہے تو اس کی حوصلہ شکنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی ہے اور حضراتِ صحابہؓ نے بھی۔ اگر کسی نے دین کے معاملہ میں تشدد کی راہ اختیار کرنی چاہی تو حضورؐ نے اس کو متنبہ فرمایا کہ 'جو دین سے دھینگا مشتی کرنی چاہے گا تو وہ شکست کھا جائے گا'۔

بعض لوگوں نے زندگی کی بعض لذتوں کو دین داری کے خلاف سمجھ کر ترک کر دینے کے اظہار کیا تو حضورؐ نے ان کو تنبیہ فرمائی کہ 'میں تم سب سے زیادہ علم رکھنے والا اور اپنے رب سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں تو جب میں یہ سارے کام کرتا ہوں تو تم ان سے کیوں احتراز کرو'۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ:

صنع النبي صلى الله عليه وسلم شيئاً ترخص فيه وتنزه عنه قوم - فبلغ ذالك النبي صلى الله عليه وسلم فحمد الله، ثم قال: ما بال اقوام يتنزهون عن الشيء اصنعه. فوالله انى اعلمهم بالله واشدهم له خشية[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کام کیا اور بعد میں اس میں رخصت دے دی تو بعض لوگ اس رخصت سے فائدہ اٹھانے سے احتراز کرنے لگے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی۔ پھر فرمایا، بعض لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ان کاموں کو کرنے سے احتراز کرتے ہیں جن کو میں خود کرتا ہوں۔ خدا کی قسم! میں ان سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں اور ان سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں۔

ایک دوسری حدیث سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہوتی ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول: لا تشددوا على انفسكم فيشدد عليكم. فان قوماً شددوا على انفسهم فشدد الله عليهم. فتلك بقاياهم في الصوامع والديار[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ تم اپنے تئیں تشدد کی راہ مت اختیار کرو کہ اللہ تعالیٰ بھی تمہارے باب میں تشدد کی پالیسی اختیار کرنے لگے۔ ایک قوم نے اپنے اوپر سختی کی روش اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے لیے سختی ہی کو روا رکھا۔ انہی کی یادگاریں کلیساؤں اور گرجوں میں دیکھ رہے ہو۔

جن لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال بسا ہوا تھا کہ نفس کو زیادہ سے زیادہ مشقت میں ڈالنا روحانی ترقی کے لیے ضروری ہے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ تمہارے نفس کا بھی تمہارے اوپر حق ہے۔ اسی ذیل میں نفس کے بعض متعلقات کے نام لے کر آپؐ نے اس تعلیم کی اچھی طرح وضاحت بھی فرما دی کہ لوگوں کو اس کے سمجھنے میں کوئی اشتباہ نہ رہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ:

قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا عبد الله! الم أخبر انك تصوم النهار وتقوم

مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم دن کو روزے رکھتے ہو اور رات بھر نمازیں پڑھا کرتے ہو؟ میں نے عرض

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب ۵

[2] سنن ابی داؤد: کتاب الادب، باب فی الحسد

اللیل ؟ فقلت : بلیٰ ، یارسول اللہ۔ قال : فلا تفعل ۔ صم وافطر وقم ونم ۔ فان لجسدك علیك حقًا ، وان لزوجك علیك حقًا ، وان لزورك علیك حقًا[1]

کیا کہ صحیح ہے ، یارسول اللہ ! آپ نے فرمایا : ایسا نہ کرو ۔ کبھی روزہ رکھو ، کبھی افطار کرو ، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی ۔ کیونکہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے ، تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے ، تمہاری جورو کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے ۔

ان تعلیموں سے اسلام کا صحیح مزاج سامنے آتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوتوں اور نعمتوں میں سے کسی چیز کو روحانی ترقی کے لیے ختم کرنے کا مطالبہ نہیں کرتا ، بلکہ پورے اعتدال کے ساتھ ، اس کے صحیح مصرف میں استعمال کرنے کی دعوت دیتا ہے ۔ رہی یہ بات کہ کسی چیز کا صحیح مصرف کیا ہے اور اس کے باب میں صحیح نقطۂ اعتدال کیا ہے اور اس اعتدال کی تربیت کے لیے انسان کو کیا راہ اختیار کرنی چاہیے تو ان میں سے کسی سوال کے جواب کے باب میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو تاریکی میں نہیں چھوڑا ہے ، بلکہ قوتوں کے صحیح محل استعمال کی بھی وضاحت کی ہے اور وہ طریقے بھی تعلیم کیے ہیں جن پر عمل کرکے انسان اپنے رہوارِ نفس کو لگام لگا سکتا اور اس کو جادۂ مستقیم پر استوار رکھ سکتا ہے ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو لوگ اپنی دین داری کی نمائش کرنی چاہتے ہیں وہ صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتے جو اللہ اور رسول نے بتایا ہے ، بلکہ وہ یہ کرتے ہیں کہ جو چیز دین میں سیر بھر مطلوب ہے اس کو من بھر بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو ان کی طرف توجہ ہو کہ اصلی دین دار یہ ہیں اس لیے کہ ان کا گول دوسروں سے آگے ہے حالانکہ ان کی یہ نمائش عارضی ہوتی ہے ۔ بہت جلد وہ وقت آجاتا ہے جب وہ دین کی اصل چیز کو تو چھوڑ بیٹھتے ہیں اور اپنی ایجاد کی ہوئی بدعت کو اس کی جگہ اصل قرار دے لیتے ہیں ۔ اس طرح سنت تو مٹ جاتی ہے اور اس کی جگہ بدعت رہ جاتی ہے ۔ شاید نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ اس طرح کے الفاظ فرمائے ہیں کہ جو بدعت بھی وجود میں آتی ہے وہ ایک سنت کو مٹا کر وجود میں آتی ہے ۔

نفس کے حقوق

نفس کے بارے میں یہ غلط فہمیاں غور کیجیے تو خاصی سنگین ہیں ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اربابِ تصوف

---

[1] صحیح البخاری : کتاب الصوم ، باب حق الجسم فی الصوم ۔

نے بھی اس باب میں تقریباً وہی نقطۂ نظر اختیار کر لیا ہے جو عیسائی متکلمین اور ان کے راہبوں کا ہے ۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ اس میں ہندو جوگیوں کے تصورات کی بھی آمیزش ہے ۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہم قرآن اور حدیث کی روشنی میں بتائیں کہ نفس کے ہم پر کیا حقوق ہیں اور وہ کس طرح ادا کیے جا سکتے ہیں ۔

پہلا حق ـــــــ معرفتِ نفس :

ہمارے اوپر نفس کا پہلا حق یہ ہے کہ ہم اس کی صحیح صحیح معرفت حاصل کریں ۔ انسان ایک عالمِ اصغر ہے اور اس کے نفس کے چھوٹے سے آئینہ میں وہ سب کچھ منعکس کر دیا گیا ہے جس کا جاننا اس کی زندگی کی رہنمائی کے لیے ضروری ہے ۔ حکماء میں سے جو واقعی حکیم ہیں ، انھوں نے اس حقیقت کا سراغ دیا ہے ۔ سقراط ، جو تمام حکماء کا امام ہے ، کا یہ قول مشہور ہے کہ " اے انسان ! تو اپنے کو پہچان " ! افلاطون نے اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ کہا ہے کہ روحِ انسانی کو اس دنیا میں بھیجنے سے پہلے تمام حقائق سے آگاہ کر دیا گیا ہے ، لیکن اس پر ذہول طاری ہو گیا ہے ۔ تذکیر اور تذکر سے اس کی یاد دہانی ہوتی رہتی ہے ۔ ارسطو کی رائے یہ ہے کہ انسان کے نفس کے اندر جو خزانہ ہے اگر وہ اس کو برآمد کر لے تو اس کے لیے کافی ہے ؛ بعد کے ادوار میں بھی تمام قابلِ ذکر حکماء نے اس حقیقت کا اظہار و اعتراف کیا ہے ۔

قرآن میں بھی یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ اس دنیا میں بھیجے جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم کی ارواح سے اپنی توحید اور ربوبیت کا اقرار لیا ہے :

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰی ۚ شَهِدْنَا ۚ

اور یاد کرو ، جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے ـــــ ان کی پیٹھوں سے ـــــ ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر ۔ پوچھا : کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں ؟ بولے : ہاں ، تو ہمارا رب ہے ۔ ہم اس کے گواہ ہیں ۔

(الاعراف - ۷ : ۱۷۲)

قرآن میں یہ بات بھی واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی کے تمام مبادی الہام کر دیے ہیں تاکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو جائے :

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝

شاہد ہے نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا ۔ پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی ۔

(الشمس - ۹۱ : ۷ - ۸)

قرآن میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے، اگرچہ وہ کتنی ہی سخن سازیاں کرے :

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌۙ	بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے ، اگرچہ کتنے
وَّ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِیْرَهٗؕ	ہی بہانے پیش کرے ۔

(القیٰمۃ - ۷۵ : ۱۴ - ۱۵)

یہ تمام باتیں دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے دُہرا انتظام فرمایا ہے ۔ سب سے پہلے اس کی فطرت کو اپنی ہدایت سے نوازا ۔ اس کے بعد اپنی وحی سے بھی اس کو مشرف کیا تاکہ اندر اور باہر، دونوں طرف سے اس کو نور حاصل ہو اور وہ جیسا چاہیے تو 'نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ' بن جائے ۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ باہر کے نور کی بھی حقیقی قدر انہی کے اندر پیدا ہوتی ہے جن کا اندر کا نور زندہ ہوتا ہے ۔ وہ ان کے لیے دلیل اور رہنما کا کام کرتا ہے ۔ جو اپنے اندر کے نور کو بجھا دیتے ہیں وہ باہر کے نور سے بھی محروم رہتے ہیں ۔

اس وجہ سے انسان کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کے مخفی خزانوں سے اچھی طرح واقف ہو، ان کا برابر جائزہ لیتا رہے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے ۔ اپنے اندر کی آواز انسان کے لیے سب سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے اس کو وہ جس طرح سنتا اور سمجھتا ہے اور پھر اس پر اس کو جس درجہ اذعان ہوتا ہے اس درجہ اذعان خارج کی آواز پر مشکل ہی سے ہوتا ہے ۔ یہ آواز اپنی صداقت کے لیے کسی دلیل کی محتاج نہیں ہوتی، بلکہ خود آپ اپنی دلیل ہوتی ہے ۔

دوسرا حق ـــــ تربیتِ نفس :

نفس کا دوسرا حق یہ ہے کہ انسان اس کی تربیت کرے ۔ تربیت سے مراد یہ ہے کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو روشنی ودیعت فرمائی ہے کوشش کرے کہ وہ بجھنے نہ پائے، بلکہ اس میں برابر افزونی ہوتی رہے ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس سے کبھی تغافل نہ برتے، بلکہ اس کی ہر آواز کو سنے اور اس پر لبیک کہے ۔ انسان کا ضمیر کبھی رہنمائی کرنے میں غفلت نہیں برتتا، لیکن انسان بعض اوقات اپنی خواہشوں کے دباؤ کے تحت اس کی تعمیل سے کترانے کے لیے کچھ مصلحتیں اور بہانے پیدا کرلیتا ہے ۔ اگر وہ اس طرح کی بہانہ بازی کا خوگر ہوجائے تو پھر ضمیر کی قوت کمزور ہوجاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ بالکل مضمحل، بلکہ بے جان ہوجاتا ہے ۔ یہ حالت ظاہر ہے کہ ضمیر کی موت کے ہم معنی ہے اور اگر ضمیر مردہ ہوجائے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اب فطرت کی ترجمانی کرنے والا کوئی نہیں رہا اور انسان اپنے باطن کی روشنی سے بالکل محروم ہوگیا ۔

اس فتنہ سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے ضمیر کی مخالفت سے اپنے امکان کی حد تک اپنے کو بچائے اور اگر اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے اس لیے کہ ضمیر کی

موت ایسی چیز نہیں ہے جو کسی حالت میں بھی گوارا کی جائے ۔ جس آدمی کا ضمیر مردہ ہوچکا ہو اس کی زندگی زمین کے لیے لعنت ہے ۔ جس شخص سے اس طرح کا گناہ صادر ہو وہ اگر پھر روحانی زندگی حاصل کرنا چاہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ خالق اور خلق، دونوں کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کرے اور اپنے ضمیر اور اپنے رب سے بصمیم قلب اقرار کرے کہ آئندہ وہ اس جرم کا ارتکاب نہ کرے گا ۔

تربیتِ نفس کے اس جہاد میں اس نصب العین کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی کمال درجہ ترقی کا بتایا ہے ۔ کمال درجہ ترقی کے باب میں ہمارا نقطۂ نظر صوفیوں کے نقطۂ نظر سے بہت مختلف ہے ۔ صوفی حضرات تو اپنے وحدت الوجود کے فلسفہ کے تحت نفسِ انسانی کے لیے کمال درجہ ترقی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خدا میں ضم ہو جائے ۔ ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

لیکن ہمارے نزدیک یہ محض شاعری اور خیال آرائی ہے ۔ قرآن کی روشنی میں نفس کی سب سے بڑی ترقی یہ ہے کہ اس کی ایسی تربیت ہوجائے کہ وہ نفسِ مطمئنہ بن جائے تاکہ آخرت میں اس کو 'رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً' کا اعلیٰ ترین مرتبہ حاصل ہوجائے :

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُۗۖ ارْجِعِیْۤ	اے وہ جس کا دل (اپنے رب پر) جما رہا! چل
اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةًۚ	اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ
(الفجر - ۸۹ : ۲۷ - ۲۸)	سے راضی ۔

'نفسِ مطمئنہ' سے مراد یہ ہے کہ دل اس طرح خدا اور اس کی باتوں پر ٹھک جائے کہ سخت سے سخت حالات میں بھی وہ ڈانواڈول اور اپنے نصب العین سے منحرف نہ ہو ۔ 'رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً' سے مقصود یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مقام حاصل کرے کہ پکار اٹھے کہ جو کچھ اس نے اپنے رب سے امیدیں باندھیں وہ اس کے گمانوں اور امیدوں سے کہیں زیادہ پوری ہوئیں اور اس کا رب بھی اس کو بندگی کے معیار پر پورا پائے ۔ بس یہی مقام سب سے اونچا مقام ہے ۔ جو یہ حاصل کرلے اس کے لیے 'فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْۙ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ' (الفجر - ۸۹ : ۲۹ - ۳۰) (داخل ہوجا میرے بندوں میں اور داخل ہوجا میری بہشت میں) کی بشارت ہے، اگرچہ اس نے نہ کبھی کوئی بشارت انگیز خواب دیکھا ہو اور نہ کبھی اس پر کوئی غیب منکشف ہوا ہو ۔ اور جو اس سے محروم رہا وہ اللہ تعالیٰ سے محروم ہے اگرچہ وہ پانی پر چلتا اور ہوا میں اڑتا ہو ۔

تربیتِ نفس کے لیے نصب العین کی حیثیت تو اسی چیز کو حاصل ہے، لیکن یہ عمر بھر کے لیے ایک کٹھن جہاد ہے اس وجہ سے اس میں ہر قدم پر رہنمائی اور مدد کی ضرورت ہے ۔ یہ ضرورت قرآن مجید کے تدبر اور

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی سے پوری ہوگی، بشرطیکہ آدمی آزاد ذہن کے ساتھ مطالعہ کرے، تقلید و تقیّد سے آزاد ہو اور اس بات پر ایمان رکھتا ہو کہ صحیح اور کامل علم کی دولت صرف حضراتِ انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوئی۔

تیسرا حق ——— عزتِ نفس :

نفس کا تیسرا حق یہ ہے کہ آدمی اس کی عزت کرے۔ 'عزت' سے یہ مراد نہیں ہے کہ آدمی اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے کہ ہم چومن دیگرے نیست۔ یہ عزتِ نفس نہیں، بلکہ کبرِ نفس ہے۔ جو اس میں مبتلا ہوا وہ شیطان کے سب سے بڑے فتنہ میں مبتلا ہوا اور اس کی ہلاکت یقینی ہے۔

'عزتِ نفس' سے ہماری مراد یہ ہے کہ انسان اس امرِ واقعی کو ہمیشہ یاد رکھے کہ اس کے رب نے اس کو اپنی خلافت سے نوازا ہے، اس کو اس عظیم امانت کا امین بنایا ہے جس کو آسمان اور زمین نہ اٹھا سکے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ

اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھایا۔

(الاحزاب - ٣٣ : ٧٢)

اس کے رب نے اس کے اندر وہ قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائیں جو اپنی تمام مخلوقات میں سے کسی کو بھی نہیں بخشیں۔ دنیا کی ہر چیز اس کے لیے مسخر کی گئی، لیکن وہ کسی کے لیے نہیں مسخر کیا گیا؛ بلکہ اس کے رب نے اس کو صرف اپنی بندگی کے لیے خاص کیا ہے۔ اس سرفرازی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی ایسی بات کا مرتکب نہ ہو جو اس کے اس تمام شرف کو خاک میں ملا دے۔

انسان کا جتنا بڑا مرتبہ ہے اتنی ہی بڑی ذلت بھی اس کے لیے ہے، اگر وہ اس مرتبہ کی قدر نہ کرے چنانچہ قرآن میں مختلف اسلوبوں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ انسان اگر اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی عزت کی قدر نہیں کرتا تو پھر وہ 'اسفل سافلین' کے کھڈ میں پھینک دیا جاتا ہے جس سے اس کو کبھی نکلنا نصیب نہیں ہوتا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا، پھر ہم نے اس کو ادنیٰ درجہ میں ڈال دیا جب کہ وہ خود گرنے والا بنا۔

(التین - ٩٥ : ٤-٥)

سورۂ اعراف میں یہود کی تاریخ بیان کرتے ہوئے واضح فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قوموں کی امامت بخشی، لیکن انھوں نے اس کی قدر نہیں کی تو ان کو تنبیہ فرمائی گئی کہ وہ متنبہ ہوں، لیکن جب انھوں نے اس سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کیا تو اللہ نے ان کو ذلیل کر دیا اور وہ کتوں کے مانند ہو کے رہ گئے جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کو اگر ماریے تو بھی زبان نکالے رکھتے ہیں اور اگر چھوڑ دیجیے جب بھی زبان نکالے رکھتے ہیں:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ ۚ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۚ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ

اور ان کو اس کی سرگزشت سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیات عنایت کیں تو وہ ان سے نکل بھاگا، پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کے ذریعہ سے سربلند کرتے، لیکن وہ زمین ہی کی طرف جھکا اور اپنی خواہشوں ہی کا پیرو بنا رہا۔ تو اس کی تمثیل کتے کی ہے کہ اگر تم اس کو دھتکارو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے یا چھوڑو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔ یہ تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔

(الاعراف - ٧ : ١٧٥ - ١٧٦)

اس عزتِ نفس کے تحفظ کے لیے چند حقیقتوں کا شعور ہر لحظہ انسان میں تازہ رہنا چاہیے ورنہ شیطان اس کو کسی ایسے فتنہ میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں مبتلا ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل ہونے کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ ذلت کے حوالہ کر دے تو اس کو کوئی بھی عزت دینے والا نہیں بن سکتا۔ اس حقیقت کو قرآن نے یوں واضح فرمایا ہے کہ:

وَمَنْ يُهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُكْرِمٍ ۚ

اور جس کو خدا ذلیل کر دے تو اس کو کوئی دوسرا عزت دینے والا نہیں بن سکتا۔

(الحج - ٢٢ : ١٨)

اس سلسلہ میں سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ انسان اس نکتہ کو ہمیشہ یاد رکھے کہ جو شخص خود اپنی عزت نہیں کرتا اس کی دوسرے بھی عزت نہیں کرتے۔ ایک حکیم شاعر کا قول ہے کہ:

من لا یکرم نفسہ لا یکرم

(جو خود اپنی عزت نہیں کرتا اس کی دوسرے بھی عزت نہیں کرتے)

مطلب یہ ہے کہ جب آپ خود اپنی پیشانی کی، اپنی نگاہ کی، اپنی زبان کی اور اپنی عقل و ذہانت کی قدر نہیں کرتے، بلکہ ان کو خریدنی و فروختنی شے سمجھ کر ہر اس شخص کے ہاتھ بیچتے ہیں جو آپ کو کچھ پیسے دے، قطع نظر اس سے کہ اس کا معیار کیا ہے اور جس مقصد کے لیے وہ خرید رہا ہے اس مقصد کے لیے ان کا استعمال ان کے خالق نے جائز بھی رکھا ہے یا نہیں تو پھر آپ کو یہ شکایت نہیں ہونی چاہیے کہ دوسرے آپ کے گھر کو پتھر کے برابر سمجھتے ہیں اس لیے کہ خود آپ کی نگاہوں میں ان کی اس سے زیادہ قدر نہیں ہے۔ جب آپ کی پیشانی ہر دروازے کے سجدے سے آلودہ ہے، آپ کی نگاہ ہر تاک جھانک کے لیے آزاد ہے، آپ کی زبان ہر اہل و نااہل کی قصیدہ خوانی کر سکتی ہے، آپ کا قلم ہر ایک کی شان میں کالم لکھ سکتا ہے اور آپ اپنی ذہانت کفر اور اسلام، دونوں کے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں، سوال صرف قیمت کا ہے تو پھر معاف کیجیے کہ جس طرح ایک بازاری عورت کسی احترام کی حق دار نہیں سمجھی جاتی آپ بھی کسی عزت و احترام کے حق دار نہیں ہیں۔

چوتھا حق ـــــ احتسابِ نفس:

نفس کا چوتھا حق یہ ہے کہ اس کا برابر محاسبہ کرتے رہیے کہ اس نے کیا نیکی کمائی ہے اور کیا برائی کمائی ہے کیونکہ اس چیز پر آپ کی نجات یا ہلاکت کا انحصار ہے۔ مرنے کے بعد آپ کے عمل کے سوا اور کوئی چیز کام آنے والی نہیں ہے۔ یہی پکڑوائے گا اور یہی چھڑائے گا اس کے ذرہ ذرہ کا حساب ہونا ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس حساب سے پہلے آپ خود اپنا حساب کر رکھیں۔ اس سے متعلق حضرت عمرؓ کا ایک نہایت حکیمانہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا	اپنے نفسوں کا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا احساب
وتزینوا للعرض الاکبر۔ وانما	ہو اور بڑے میدان کے واسطے تیار ہو جاؤ اور بے شک
یخفت الحساب یوم القیامۃ	قیامت کے دن کا حساب اسی پر آسان ہوگا جو
علی من حاسب نفسہ فی الدنیا۔[1]	دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے گا۔

قرآن میں یہ ہدایت موجود ہے کہ:

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ	اور چاہیے کہ ہر نفس اچھی طرح جائزہ لے رکھے
لِغَدٍ (الحشر - ۵۹ : ۱۸)	اُس کا جو اُس نے کل کے لیے کیا ہے۔

یہ جائزہ برابر لیتے رہنا چاہیے۔ یہ کام ہر روز سونے سے پہلے بھی آپ کر سکتے ہیں، لیکن موزوں ترین

---

[1] سنن الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، باب ۲۵

وقت اس کا فجر سے پہلے یعنی تہجد کا ہے، بشرطیکہ اس کی توفیق حاصل ہو۔ قرآن کے اشارات سے اس مقصد کے لیے اس وقت کی موزونیت واضح ہے۔ اس وقت رحمتِ آسمانی مغفرت کرنے والوں کی تلاش میں ہوتی ہے۔ کیا عجب کہ کسی خوش قسمت کی قسمت لڑ جائے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔

اپنا محاسبہ کرنے میں رواداری اور ڈھیل سے کام نہ لیجیے اور نہ اپنے کو الاؤنس دینے کی کوشش کیجیے بلکہ ایک ایک چیز پر نگاہ ڈالیے اور ہر کوتاہی اور حق تلفی کی تلافی کی کوشش کیجیے۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے معاملہ میں تو توبہ و استغفار سے گناہ دھل جاتے ہیں، لیکن بندوں کے حقوق کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ اس میں ضروری ہے کہ تابحدِ امکان اس ظلم کی تلافی کی جائے جو صادر ہوا ہے اور بندے کو بھی راضی کیا جائے اور ساتھ ہی اپنے رب سے بھی اس تعدی کی معافی مانگی جائے جس کا ارتکاب ہوا ہے۔

بقیہ: ستاروں کی تاثیر کا عقیدہ

علمی تحقیق اس بات کی شاہد ہوتی ہے کہ فلاں آثار کے بعد فلاں نتائج رونما ہوتے ہیں۔ مثلاً آگ چیزوں کو جلا دیتی ہے، مون سون ہوائیں ایک خاص موسم میں چلتی اور بارش برساتی ہیں، جس کے بعد بارش ہونے یا تیز ہوا چلنے کا امکان ہوتا ہے۔ اس طور پر اسباب کا نام لینے میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ اس میں عقیدہ کو دخل نہیں ہوتا بلکہ تجربہ یا عادت یا تحقیقات علمی کو دخل ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس طرح کے معاملات میں تجربہ پر مبنی کوئی بات فرما دیا کرتے تھے۔ مثلاً مؤطا میں یہ خبر نقل ہوئی ہے کہ:

عن مالک انہ بلغہ ان رسول	مالکؒ کو یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول اذا	فرمایا کرتے تھے کہ جب سمندر سے ہوا اٹھے
انشأت بحریۃ ثم تشاءمت	اور شام کا رخ اختیار کرلے تب ہوتی ہے دھوم
فتلک عین غدیقۃ۔	کی بارش۔

معلوم ہوا کہ یہ بات حضورؐ کے مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی تھی کہ سمندر کی طرف سے شام کے رخ پر چلنے والی ہوا بارش برساتی ہے۔ اگر اسباب و عوامل کا ذکر کرنا مطلقاً جائز نہ ہوتا، تو آپؐ ہرگز ایسا نہ فرماتے۔

البتہ مشاہدہ و تجربہ پر مبنی باتیں بھی بسا اوقات غلط ثابت ہوتی ہیں۔ قرآن بارش کے حق میں ہوتے ہیں، لیکن عین وقت پر کسی جانب ہوا کا دباؤ کم یا زیادہ ہو جانے سے نم آلود ہوا کا رخ بدل جاتا ہے اور توقع یا پیشین گوئی پوری نہیں ہوتی۔ اس لیے عقیدہ یہی ہونا چاہیے کہ عادت مستمرہ پر بھی اللہ تعالیٰ کی ذات متصرف ہے۔ اسی کے حکم اور اذن سے دنیا کے تمام امور طے پا رہے ہیں اور زبان سے بھی وہی بات ادا کرنی چاہیے جو صحیح عقیدہ پر مبنی ہے۔

امین احسن اصلاحی

عیدالاضحیٰ کا پیغام

عیدالاضحیٰ کے معنی قربانی کی عید کے ہیں۔ عیدالاضحیٰ ایک عام قسم کی عید نہیں بلکہ یہ اس قربانی کی یادگار ہے جو ہر سال بیس پچیس لاکھ حُجاجِ کرام مروہ کے دامن اور منیٰ کے میدان میں کرتے ہیں۔ قربانی مناسکِ حج میں سے ایک منسک ہے۔ حج کے مناسک اور احکام و آداب سب کے سب بیت اللہ اور اس کے مضافات میں ہی ہو سکتے ہیں، اور کہیں نہیں ہو سکتے۔ طواف جو شمع اور پروانہ کی حکایت کو تازہ کرتا ہے وہ صرف بیت اللہ کے اردگرد ہو سکتا ہے۔ سعی صرف صفا اور مروہ کے درمیان ہو سکتی ہے۔ عرفات اور مزدلفہ کی حاضری بھی وہیں ہو سکتی ہے، لیکن قربانی کی ایک خصوصیت ہے۔ مناسکِ حج میں سے صرف یہی ایک چیز ہے جو دنیا کے خطے خطے میں منائی جاتی ہے۔ جس گلی کوچے میں بھی اللہ کا کوئی بندہ صاحبِ استطاعت ہو وہ اس قربانی کی سعادت میں شریک ہو سکتا ہے مگر حج کے دوسرے مناسک میں سے کوئی اور کام نہیں کر سکتا۔ یہ مسئلہ قابلِ غور ہے کہ قربانی کی وہ کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اس کا فیض عام کر دیا گیا ہے۔

قربانی درحقیقت دینِ اسلام کی حقیقت، اس کی روحانیت اور اس کے فلسفے کا ایک عملی مظاہرہ ہے اور حج کی عبادت جس سے اسلام کو ممثل اور مشہود کیا گیا ہے، ساری کی ساری اس قربانی کے گرد گھومتی ہے۔ جس کا مظاہرہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے کیا۔ اسلام کی اصل حقیقت بندے کا یہ اقرار اور عزم ہے کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت، سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے) اس حقیقت کو سب سے زیادہ نمایاں، سب سے زیادہ مبرہن، سب سے زیادہ واضح اور روشن طریقے سے اگر کسی نے پیش کیا ہے تو وہ سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام ہیں۔ قربانی کا اصل مرکز اگرچہ مروہ کی پہاڑی کا دامن ہے جسے منیٰ تک وسعت دی گئی ہے لیکن چونکہ یہ اسلام کی حقیقت کی مظہر ہے جس سے ہر مسلمان کو روشناس ہونا چاہیے

اور یہی حج کی اصل روح بھی ہے اس لیے اس کو عام کر دیا گیا ہے۔ قربانی کی عمومیت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اسی وقت کیا تھا جب اس قربانی کی بنیاد دنیا میں پڑی تھی اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی اللہ کی راہ میں پیش کی تھی۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے فرما دیا تھا کہ تم نے اپنے عزیز ترین بیٹے کی قربانی دی تو میں نے اس بیٹے کو ایک عظیم قربانی کے عوض چھڑا لیا ہے۔ اس کی یادگار میں ایک عظیم قربانی دنیا میں قائم ہو گی۔

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ (الصّٰفّٰت: ۱۰۷-۱۰۸)

اور ہم نے اس کو چھڑا لیا ایک ذبح عظیم کے بدلہ میں اور اس روایت پر چھوڑا پچھلوں کو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں یہ بات سب کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں بڑھاپے تک کوئی اولاد نہیں تھی، بیوی اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی تھی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ میں جس دعوت کا امین ہوں اور جس دعوت کے لیے میں نے اتنی قربانیاں دی ہیں اور آگ کے سمندر سے ہو کر گزرا ہوں، میرے بعد اس دعوت کا وارث اور حامل کون ہو گا؟ چنانچہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے رب! مجھے فرزند عطا فرما جو اس دین کا حامل اور اس دعوت کا وارث بنے۔ یہ مقصد اللہ تعالیٰ کو بھی عزیز تھا اس لیے اس نے ان کی دعا قبول کی، اور ناممکن کو ممکن کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرزند عطا فرمایا تو اس کا نام انھوں نے اسماعیل رکھا جس کا عبرانی قاعدے سے ترجمہ ہو گا 'وہ فرزند جس کے بارے میں میرے رب نے میری دعا سنی'۔ جو فرزند اتنی دعاؤں، مناجاتوں اور سرگوشیوں کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑھاپے میں عطا ہوا، اندازہ کیجیے وہ کس قدر محبوب ہو گا! اسی فرزند کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ امتحان پیش آتا ہے کہ اس کو میری راہ میں قربان کر دو۔ اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر وہ تھی جو بیٹے کی سب سے زیادہ محبوبیت کی عمر ہوتی ہے یعنی غالباً بارہ تیرہ سال، جب بیٹے کی پیشانی کے اندر باپ کو اپنا مستقبل نظر آتا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام قربانی کے اس حکم کی سوکاویلیں کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے منشائے خداوندی کو پورا کرنے میں دیر نہیں لگائی اور فوراً بیٹے کی گردن پر چھری چلانے کے لیے تیار ہو گئے۔ چشمِ فلک نے اس نوعیت کا صرف یہی واقعہ دیکھا ہے۔ حماقت سے، ظلم سے، یا جی پن یا خلل دماغ میں مبتلا ہو کر تو ہو سکتا ہے کہ کسی نے اپنی اولاد کو قتل کر دیا ہو مگر ہوش و حواس کے قائم ہوتے ہوئے کوئی شخص ایسی قربانی کی جرأت تو کیا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ایک بہت بڑے حکیم اور پیغمبر بھی تھے، اقدام سے پہلے انھوں نے اپنے بیٹے سے استفسار کیا، يٰبُنَيَّ اِنِّیْٓ اَرٰى فِى الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى (بیٹا! میں خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں تجھے (خدا کی راہ میں) ذبح کر رہا ہوں۔ بتاؤ تمھاری کیا رائے ہے؟) بیٹا بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا تھا۔ انھوں نے کہا: يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ فِیْ

إِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ۔ (اباجان! آپ کیجیے جو آپ کو حکم مل رہا ہے۔ آپ مجھے ان شاء اللہ ثابت قدم پائیں گے)۔ اس کے بعد قرآن مجید میں آتا ہے: فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ۔ (جب دونوں کے دونوں اسلام کے نشے میں سرشار ہوگئے تو بوڑھے باپ نے اپنے محبوب فرزند کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا (تاکہ چھری چلائے) تو اس وقت فرشتے نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا کہ بس اس سے زیادہ نہیں: قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا (تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا) اسی وقت حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت بھی دی گئی کہ تو نے اپنی سب سے زیادہ عزیز اور محبوب چیز کو مجھ سے دریغ نہیں رکھا اس لیے اس فرزند کی نسل سے دنیا میں میں ایک عظیم امتِ مسلمہ برپا کروں گا جس کا ماٹو اور شعاری کلمہ یہ ہوگا: اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں اکیلے نبی اور رسول ہیں۔ ان کی تعلیم و دعوت سے یہ امتِ مسلمہ دنیا میں برپا ہوئی۔ اس امت کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ تھا کہ جب تک اس کے اندر قربانی کی یہ روح باقی رہے گی اس وقت تک دریا اور پہاڑ کوئی بھی اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکے۔ پہاڑ اس کے لیے راستہ دے گا، سمندر اس کے لیے خشک ہو جائے گا، ہوائیں اس کے لیے رک جائیں گی اور طوفان اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیں گے، کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ یہ امت دنیا کے بھاگوں کی مالک ہوگی، تمام دنیا کی سیادت کرے گی، تمام دنیا کو درس دے گی، تمام دنیا کو تعلیم دے گی، کلچر اور ثقافت تہذیب اور تمدن، قانون اور آئین، سب کچھ سکھائے گی اور دنیا کو یہ بتائے گی کہ اللہ کی بندگی کا مفہوم کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ سچا ثابت ہوا اور یہ امت مشرق، مغرب، شمال اور جنوب ہر سمت میں پھیل گئی۔ اس نے دنیا کی ہر تہذیب کو متاثر کیا۔ ہر کلچر کو اپنے کلچر کے رنگ میں رنگ دیا، دنیا کی ہر برائی پر کاری ضرب لگائی اور ہر نیکی کو فروغ دینے کے لیے اپنے خون سے اس کی آبیاری کی۔ غرض دنیا کے چپے چپے کو اس امت نے بلاواسطہ یا بالواسطہ متاثر کیا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ وعدہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھا کہ یہ امتیاز صرف اس وقت تک اس کو حاصل ہوگا جب تک اس امت کا شعار اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا کلمہ ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد پیش آنے والے واقعات بیان فرماتے ہوئے اس حقیقت سے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا تھا۔ ایک مشہور حدیث ملاحظہ ہو:

عن ثوبان قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يوشك الامم ان تداعى عليكم كما تداعى

ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قومیں تم پر ایک دوسری کو اس طرح بلائیں گی جس طرح کھانے والے

الاكلة الى قصعتها فقال قائل ومن قلة نحن يومئذ قال بل انتم يومئذ كثير ولكنكم غثاء كغثاء السيل ولينزعن الله من صدور عدوكم المهابة منكم وليقذفن فى قلوبكم الوهن قال قائل يارسول الله وما الوهن قال حب الدنيا وكراهية الموت رواه ابوداؤد والبيهقى فى دلائل النبوة۔

(مشکوٰۃ۔ باب تغیر الناس)

اپنے پیالے پر ایک دوسرے کو دعوت دیتے ہیں۔ ایک کہنے والے نے کہا ان دنوں ہماری قلتِ تعداد کے سبب سے ایسا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: نہیں بلکہ تم اس دور میں بڑی تعداد میں ہوگے لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے خس و خاشاک کی ہوگی، اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت دور کر دے گا اور تمہارے دلوں میں وہن ڈال دے گا۔ ایک پوچھنے والے نے پوچھا یارسول اللہؐ! یہ وہن کیا چیز ہوگی؟ آپ نے فرمایا "دنیا کی محبت اور موت سے ناگواری"۔

صحابہ کرامؓ کے زمانے میں مسلمانوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن آج یہ تعداد شاید ایک ارب سے بھی زیادہ ہوگی اور ان کے پاس دولت کی اتنی کثرت ہے کہ اگر وہ اپنی دولت سمیٹ لیں تو نہ جانے یورپ اور امریکہ کے کتنے بنک دیوالیہ ہو جائیں لیکن اس سب کچھ کے باوجود ان کی حیثیت کیا ہے؟ دنیا کی منڈی پر ایک بوجھ کے سوا کچھ نہیں۔ وہ دنیا کی قوموں کے لیے خوانِ یغما بن کر رہ گئے ہیں۔ جو چاہتا ہے، جدھر سے چاہتا ہے ایک بوٹی نوچ لیتا ہے اور وہ کچھ نہیں کر سکتے، سی کر کے رہ جاتے ہیں اور شاید یہ احساس بھی اب باقی رہے یا نہ رہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا جو کلمہ تھا وہ ان کی زندگی کا رہنما اصول رہا نہیں اب تو حب الدنیا وکراھیۃ الموت یعنی دنیا کی محبت اور موت کا اندیشہ ان پر مسلط ہو کر رہ گیا ہے۔

اصل چیز جس سے یہ امت زندہ رہ سکتی ہے وہ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا کلمہ ہی ہے اور یہی حج کی روح ہے۔ مناسکِ حج میں ہر سال جو ہر سال ہوتی ہے اس میں اسی حقیقت کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے تاکہ ہر عامی سے عامی مسلمان یہ دیکھ لے کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کو کس لیے زندہ رہنا ہے اور کس لیے مرنا ہے، اور وہ جان لے کہ یہی وہ امت تھی جس کے لیے یہ وعدہ تھا کہ اسے خلافتِ الٰہیہ حاصل ہوگی۔

یہاں میں اس تلخ حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان خلافتِ الٰہیہ قائم کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، صرف دنیا کی قوموں میں ایک قوم کی حیثیت ہی سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے بھی قربانی کا جذبہ اور حوصلہ درکار ہے۔ دنیا کی کوئی قوم بھی ہو اگر اس کے افراد کے پیش نظر صرف اپنی غرض، اپنی ضرورت، اپنی حرص، اپنی طمع اور اپنا مقصد ہی ہو اور وہ کسی اعلیٰ قومی مقصد کے لیے قربانی دینے کے لیے تیار نہ ہوں تو وہ قوم دنیا میں آج نہیں تو کل مرجائے گی اور ایسی مری ہوئی قوم کا شمار دنیا کی قوموں میں نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ایک قوم کے افراد میں کسی اعلیٰ مقصد کے لیے اپنا علم، اپنی عقل، اپنی جان، اپنا مال، اپنی قوت اور اپنی تدبیر صرف کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے تو وہ قوم دوسری قوموں سے بازی لے جاتی ہے چاہے وہ دنیا میں ڈکیتی کرے یا راہزنی، اور چاہے اس کا رول وہی ہو جو آج روس اور امریکہ کا ہے۔

آپ اگر دنیا کی قوموں کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، ان کے اندر عزت کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ افراد اپنی ذات سے باہر نکل کر حقیقتوں کو سوچنے کی کوشش کریں۔ اپنی ملت کے مفاد، اپنی قوم کے مفاد، اور اپنے وطن کے مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح دینے کا جذبہ پیدا کریں تب آپ زندہ رہیں گے اگرچہ وہ زندگی محض ایک قوم کی زندگی ہے۔ مجھے ایک قوم کی زندگی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو حقیقت میں ہمیشہ خلافتِ الٰہیہ کے خواب دیکھتا ہوں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ لیکن آپ اگر دنیا کی قوموں میں سے ایک قوم کی حیثیت سے بھی زندہ رہنا چاہتے ہیں تو میرا یہ پیغام یاد رکھیے کہ اگر آپ میں قربانی کا ولولہ نہیں، ایک مقصد کے لیے مر مٹنے کا حوصلہ نہیں، اپنے مفاد پر قوم اور وطن کے مفاد کو ترجیح دینے کا جذبہ نہیں تو آپ دنیا میں مٹ کر رہیں گے۔

آخر میں میری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو وہ زندگی عطا فرمائے جس کے لیے امت مسلمہ مبعوث ہوئی۔ ان کا نصب العین اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہو اور انہیں دنیا میں خلافت و نیابت حاصل ہو۔ وہ امت مسلمہ کی حیثیت سے جئیں اور اسی حیثیت سے مریں۔ ان کے اندر قربانی کا جذبہ پیدا ہو اور یہ اعلیٰ نصب العین کے لیے اپنی قابلیتیں، اپنا مال اور اپنی جان صرف کرنے سے دریغ نہ کریں۔

(ترتیب: عبداللہ غلام احمد)

مراسلہ و مذاکرہ

مطالعے کے لیے معیارِ انتخاب

۲ر شوال ۱۴۰۴ھ
یکم جولائی ۱۹۸۴ء

مخدومی المکرم و المحترم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ!

کافی پرانی بات ہے، جس زمانہ میں پاکستان میں دستور و آئین کی بحث چل رہی تھی۔ میں حاضرِ خدمت ہوا، تو آپ کے مطالعہ میں (WILLOUBY) کی کتاب تھی، جس کو پڑھنے کا مجھے اس وقت بڑا اشتیاق ہوا، سوچا کہ آپ جب اس سے استفادہ کرچکیں گے تو اپنے مطالعہ کے لیے مستعار لے لوں گا۔ مگر اس زمانہ کی مصروفیات نے جلد مہلت نہ دی اور پھر یہ موضوع تازہ نہ رہا۔

حالیہ حاضری کے دوران آپ کی میز پر، مشہور فلاسفروں کے نظریات پر ایک کتاب نظر پڑی۔ اس سے بھی دلچسپی اور پڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی، مگر اپنی عدیم الفرصتی اور قلتِ وقت کے خیال سے اس کا ارادہ نہ کر سکا، اور یہ بھی وجہ ہوئی کہ فلسفہ جیسے دقیق اور خشک مضمون کا پڑھنا آسان کام نہیں، بڑی فرصت، سکون اور غور و فکر کے ساتھ ایسی کتابیں پڑھی جاسکتی ہیں۔ مجھ کو خوشگوار حیرت سی بھی ہوئی کہ آپ اپنی مصروفیات کے دوران اس موضوع پر مطالعہ کے لیے کیسے آمادہ ہوئے۔ اس دوران میں معلوم ہوا کہ آپ نے ایک بڑا طویل مضمون "کائنات میں انسان کا مقام فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں" لکھا ہے جو "تدبر" میں مکمل صورت میں آرہا ہے۔ میں معاً سمجھ گیا کہ آپ کے اس کتاب کے مطالعہ کی غرض کیا تھی۔ اس دن سے پرچہ کا انتظار تھا، ملتے ہی مطالعہ کیا۔ پہلی خوشی اس کو پڑھ کر یہ حاصل ہوئی کہ ان فلسفیوں کی خشک اور باریک منطقی بحثوں کو پڑھنے کی محنت بچ گئی۔ ہر ایک کے بارے میں ایک ایسا مختصر مگر جامع خلاصہ سامنے آگیا کہ ایک ایک کا نقطۂ نظر اور اخذ کردہ نتیجہ معلوم ہو جاتا ہے پھر قرآن کی روشنی میں ان پر تنقید پڑھ کر ایسے عظیم اور نامور فلسفیوں سے مرعوبیت یک قلم ختم ہو جاتی

ہے۔ یہ قرآن مجید میں تدبر اور تفکر کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مؤلفِ محترم کو وہ فراست و حکمت عطا فرمادی ہے کہ اتنے بڑے بڑے مفکرین کے خیالات کی غلطی اور دلائل کی کمزوری کو اتنے آسان اور دل نشین انداز میں بے بنیاد، مہمل اور لغو ثابت کر دیا ہے کہ ہم جیسے عامیوں کو بھی ان فلاسفروں کے نظریات کی غلطیاں نظر آنے لگتی ہیں۔

عرصہ دراز سے میں نے کسی کتاب، رسالہ یا مضمون اور تقریر کو پسند یا ناپسند کرنے کا ایک خود ساختہ معیار بنا رکھا ہے: یا تو کسی چیز کو پڑھ کر یا سن کر نئی معلومات حاصل ہوں یا معلومات میں اضافہ نہ ہو تو معلوم باتیں ایک نئے اسلوب اور زاویہ سے سامنے آئیں یا کم از کم اس سے قلبی کیف اور ذہنی سرور حاصل ہو۔

تفسیر تدبر قرآن کے مطالعہ کے دوران مختلف مواقع پر یہ مختلف تاثرات بکثرت حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ اب "تدبر" کی ہر اشاعت میں یہ تینوں کیفیات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔ اس سے زیادہ کی اور کیا خواہش ظاہر کی جائے۔ مذکورہ مضمون میں یہ سب کچھ ایک ہی جگہ موجود ہے۔ یوں ہر مضمون جدا جدا کیفیت کا حامل اور لائقِ صد تحسین ہے۔

"تدبر" کے مختلف مضامین اگرچہ سلسلہ وار شائع ہو رہے ہیں مگر خوبی یہ ہے کہ ہر قسط اپنی جگہ ایک مکمل مضمون ہے جس کو پڑھتے ہوئے اگر پچھلی قسط مستحضر نہ بھی ہو، تو کوئی تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ بس لے دے کر ایک ہی چیز کی خواہش باقی رہ جاتی ہے، جیسا کہ ڈاکٹر شیر بہادر پنی صاحب نے لکھا تھا اور بکثرت قارئین کی بھی یہی خواہش ہوگی کہ "تدبر" سہ ماہی کی بجائے ماہنامہ ہو جائے تو کیا بات ہے۔ ڈاکٹر پنی صاحب تو مارے اشتیاق کے ایک ہی نشست میں سارا پرچہ پڑھ لیتے ہیں، بلکہ دوبارہ پڑھ کر قندِ مکرر کا مزہ لے لیتے ہیں مگر میں اس معاملہ میں صابر اور کفایت شعار ہوں۔ تھوڑا تھوڑا مطالعہ کر کے رسالہ کو زیادہ دنوں تک چلاتا ہوں تاکہ اگلے پرچے کے آنے کا وقت قریب آجائے۔

احقر

سلطان احمد

بخدمت گرامی جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی ۔ لاہور